ماهنامہ مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

SEPTEMBER - 1987

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلّہ

حیاتِ نو

جلد نمبر ۲ —————— شمارہ نمبر ۹

ستمبر ۱۹۸۷ء

• مدیر منتظم —————— نور محمد فلاحی

• مدیر —————— طارق فارقلیط فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

. سالانہ زرِ تعاون	۳۰ روپئے
. خصوصی تعاون	۱۰۰ روپئے
. غیر ممالک سے	۱۵ امریکی ڈالر
. فی شمارہ	۳ روپئے

پتہ ترسیل زر کا : دفتر ماہنامہ مجلہ حیاتِ نو. جامعۃ الفلاح . بلریا گنج ، اعظم گڈھ یوپی ۲۷۶۱۲۱

مطبع نعیمی پریس برائے جمال پریس دہلی —————— کاتب : رفیق احمد شاہ پوری

نقوشِ حیاتِ نو

		صفحہ
اداریہ —		
قوموں کا عروج وزوال اور قرآنی نقطۂ نظر	ایڈیٹر	۳
بحث ونظر —		
اصحاب اعراف کون ہیں؟	مولانا جلیل احسن ندویؒ	۱۰
مقالات —		
صبر جمیل	مولانا سید احمد عروج قادریؒ	۱۳
معاشرتی مسائل سے تعرض	عبید اللہ فہد	۲۱
تحریک اسلامی کی معتبر آواز	عزیز الدین عزیز	۲۴
عظمت کے پاسباں —		
حضرت ثمامہ ابن اثالؓ	ابو جاوید۔ استاذ جامعہ	۳۲
انٹرویو —		
انجینیر حکمت یار سے رفیق افغانی کی بات چیت تکبیر کراچی		۵۱
شعر ونغمہ —		
فوزیہ فاضلہ	منصف مبارکپوری	۲۲
منقبت حضرت امام حسینؓ، غزل	مشفق طاہری	۳۱
مسرت طیب، غزل	عطا عابدی، مسعود جاوید ہاشمی	۴۲
غزلیں	مبین صدیقی، ثاقب عباسی	
تعارف وتبصرہ —		
پاکستانی شاعر عبید اللہ علیم کا دیوان	ابو سفیان اصلاحی	۵۹
جامعہ کے لیل ونہار —		
تعلیمی کمیٹی کا اجلاس		۶۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اداریہ

قوموں کا عروج وزوال اور قرآنی نقطۂ نظر

دُنیا کی تاریخ درحقیقت افراد، تحریکوں اور اقوام وملل کے عروج وزوال کی داستان ہے۔ اس کا مطالعہ میں ایک ایسی دنیا کی سیر کرتا ہے جہاں ایک طرف تو آسمان کی رفعتیں ہیں، پہاڑوں کی بلندیاں ہیں، جاہ وجلال ہے، عزت وشوکت ہے، قوت وطاقت ہے، اقتدار ومسند ہیں، سربلندیاں اور سرفرازیاں ہیں تو دوسری طرف پستیاں ہیں، اقتدار سے محرومی ہے، کمزوری اور لاچاری، ذلت اور رسوائی ہے، بے بسی اور بے کسی ہے۔ تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک قوم گمنامی کے غار میں پڑی ہوئی ہوتی ہے پھر اچانک وہ اوپر اٹھنے لگتی ہے۔ اس کی تدبیریں کامیاب ہونے لگتی ہیں، وار اس کے نشانے ٹھیک ہدف پر پڑنے لگتے ہیں اور دھیرے دھیرے وہ دوسری قوموں پر چھا جاتی ہے۔ اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس کی طاقت وقوت، شان وشوکت، رعب ودبدبہ کا ڈنکا بجنے لگتا ہے اور وہ عروج کی انتہائی منزلوں پر پہنچ جاتی ہے اور ایک دوسری قوم جو ناقابل تسخیر ہوتی ہے جس کے رعب ودبدبہ سے دوسری قوموں پر لرزہ طاری ہوجاتا ہے، جس کے جاہ وجلال، شان وشوکت، قوت وسطوت کی ایک دنیا قائل ہوتی ہے اچانک اس کو گھن لگنا شروع ہوجاتا ہے اور اس کی تمام صلاحیتیں اور قوتیں گھن آلود ہوجاتی ہیں، اس کے تیر نشانے سے خطا کر جاتے ہیں، اس کی تمام تدبیریں ناکام ہوجاتی ہیں اور دیکھتے دیکھتے دوسری قومیں اس پر چڑھ دوڑتی ہیں اور وہ ذلت ورسوائی کی انتہائی پستیوں میں پہنچ جاتی ہے۔ قرآن ہم کو ایسی بہت سی اقوام وملل کی تاریخ بتاتا ہے جو اپنے اپنے دور میں بڑی ترقی یافتہ اور صاحب جبروت تھیں لیکن پھر ان کی قوت وشوکت کو گھن لگ گیا اور وہ نشانِ عبرت بن گئیں۔

أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَقَوْمِ إِبْرَاهِيمَ وَأَصْحَابِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكَاتِ (توبہ آیت ۷۰)

کیا ان لوگوں کو اپنے پیش روؤں کی تاریخ نہیں پہنچی؟ نوحؑ کی قوم، عاد، ثمود، ابراہیمؑ کی قوم، مدین کے لوگ اور وہ بستیاں جنھیں الٹ دیا گیا (قوم لوط کی بستیاں)۔

"قوم نوح اس سرزمین میں رہتی تھی جسکو ہم عراق کے نام سے جانتے ہیں۔ بابل کے آثار قدیمہ میں بائبل سے قدیم تر جو کتبات ملے ہیں اس سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس پر اللہ کی طرف سے پانی کا عذاب آیا۔ اور زمین و آسمان سے مسلسل پانی برسنے لگا اور صرف حضرت نوحؑ اور ان کے مٹھی بھر پیروؤں کے سوا سبھی ختم ہو گئے۔ یہ قوم شرک کی برائی میں مبتلا تھی۔ (تفہیم القرآن۔ صفحہ ۳۳ جلد دوم)

عاد

عرب کی قدیم ترین قوم تھی جس کے افسانے اہل عرب میں زبان زد عام تھے۔ ان کی شوکت و حشمت ضرب المثل تھی۔ قرآن کی رو سے اس قوم کا اصل مسکن احقاف کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور یمامہ کے درمیان الربع الخالی کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ یہیں سے پھیل کر ان لوگوں نے یمن کے مغربی سواحل اور عمان اور حضرموت سے عراق تک اپنی طاقت کا سکہ رواں کر دیا تھا۔ تاریخی طور پر اس قوم کے آثار دنیا سے تقریباً ناپید ہو چکے ہیں لیکن جنوبی عرب میں کہیں کہیں پرانے کھنڈر موجود ہیں جنہیں عاد کی طرف نسبت دی جاتی ہے۔ (تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۴۲)

ثمود

یہ عرب کی دوسری قدیم ترین قوم تھی۔ اس کا مسکن موجودہ زمانہ میں مدینہ اور تبوک کے درمیان حجاز ریلوے پر ایک اسٹیشن پڑتا ہے جسے مدائن صالح کہتے ہیں، یہی ثمود کا صدر مقام تھا اور قدیم زمانہ میں حِجر کہلاتا تھا۔ اب تک وہاں ہزاروں ایکڑ کے رقبے میں وہ سنگین عمارتیں موجود ہیں جن کو ثمود کے لوگوں نے پہاڑوں میں تراش تراش کر بنایا تھا۔ نزول قرآن کے زمانے میں حجاز کے تجارتی قافلے ان آثار قدیمہ کے درمیان سے گزرا کرتے تھے۔ (تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۴۵)

قوم ابراہیم

اندازہ کیا گیا ہے کہ ۲۱۰۰ قبل مسیح کے لگ بھگ زمانہ میں، جسے اب عام طور پر محققین حضرت ابراہیم کے ظہور کا زمانہ تسلیم کرتے ہیں، شہر اُر کی آبادی ڈھائی لاکھ کے قریب تھی۔ بڑا تجارتی اور صنعتی مرکز تھا۔ یہیں حضرت ابراہیم پیدا ہوئے۔ یہ شہر عراق میں دریائے فرات کے کنارے ہے۔ اس کے کتبات میں تقریباً ۵ ہزار خداؤں کے نام ملتے ہیں۔ اس وقت یہاں کا بادشاہ نمرود اور نظام مکمل طور پر مشرکانہ تھا۔ دعوت اور اتمام حجت کے بعد حضرت ابراہیم ہجرت کر گئے اور بابل کے ایک عربی النسل خاندان نے اس علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ قوم ابراہیم دنیا سے مٹ گئی اور ایسی مٹی کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ قرآن میں اگرچہ اس عذاب کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیم کے نکل جانے کے بعد ان کی قوم پر آیا لیکن اس کو شمار معذب قوموں ہی میں کیا گیا ہے۔ (سیرت سرور عالم صفحہ ۵۱۶-۵۱۸ ج ۱)

اہل مدین

یہ ایک بڑی تجارت پیشہ قوم تھی۔ قدیم زمانہ میں جو تجارتی شاہراہ بحر احمر کے کنارے یمن سے مکہ و ینبوع ہوتی ہوئی شام تک جاتی تھی اور ایک دوسری تجارتی شاہراہ جو عراق سے مصر کی طرف جاتی تھی اس کے عین چوراہے پر اس قوم کی بستیاں واقع تھیں۔ اسی بناء پر عرب کا بچہ بچہ مدین سے واقف تھا۔ (ایضاً ص۵۳)

قوم لوط

یہ قوم اس علاقہ میں رہتی تھی جسے آج کل شرق اردن کہا جاتا ہے اور عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے۔ بائبل میں اس قوم کے صدر مقام کا نام "سدوم" بتایا گیا ہے جو بحیرۂ مردار کے قریب کسی جگہ واقع تھا۔ اب بحیرۂ مردار میں غرق ہو چکا ہے۔ (ایضاً ص۵۱)

قرآن کی ان چند مثالوں کے علاوہ تاریخ ہمارے سامنے کچھ اور اوراق بھی الٹتی ہے۔ روم و ایران اپنے دور کی نہایت طاقتور سلطنتیں تھیں اور دو سپر پاور کی حیثیت ان کو حاصل تھی جیسے آج روس اور امریکہ ہیں۔ جرمنی اور برطانیہ ابھی قریب کی نہایت روشن مثالیں ہیں۔ کہا جاتا تھا کہ برطانیہ میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔ خود ہماری تاریخ بھی کچھ کم عبرتناک نہیں ہے، ہم نے ایک ہزار سال تک دنیا کے مختلف خطوں میں نہایت شان و شوکت سے حکمرانی کی ہے اور اب ذلت و رسوائی و نکبت کی انتہائی پستیوں کو چھو رہے ہیں۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ افراد، اقوام اور ملل کی زندگیوں میں آخر یہ تغیر کیوں پیدا ہوتا ہے؟ کیوں ایک قوم آسمان کی رفعتوں کو چھوتی ہے اور دوسری ذلت و رسوائی کے پاتال میں چلی جاتی ہے؟ کیوں ایک کو قیادت و سیادت اور جہانبانی کا مقام ملتا ہے اور دوسری کے حصے میں غلامی، محکومی اور محرومی آتی ہے؟ کیا یہ محض بخت و اتفاق کا نتیجہ ہے؟ یا اس کے پیچھے کچھ فیکٹرس اور عوامل کارفرما ہوتے ہیں؟ اس سوال کا جواب مختلف دانشوروں نے مختلف زاویوں سے دیا ہے لیکن قرآن کا مطالعہ ہمیں ایک اور زاویہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق اور مالک ہے جو ہر آن اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ انسان اس کا بندہ اور غلام ہے۔ خالق کائنات نے انسانوں کے لئے کچھ اصول اور ضابطے بنائے ہیں تاکہ انسان اسکی روشنی میں اچھی زندگی گزار سکے۔ لہٰذا اس دنیا کی زندگی میں انسان کو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو خدا کے احکام کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے اور چاہے تو خدا کے بھیجے ہوئے قوانین سے بے نیاز ہو کر زندگی گزارے۔ خدا کی ذات، خدائی صفات اور خدا کے اوامر و نواہی کے ساتھ انسان کا یہی رویہ اس بات کا تعین کرتا ہے کہ انسان رفعتوں کا مستحق ہے یا پستیوں کا، عروج کا حقدار ہے یا زوال کا، دوسرے لفظوں میں عروج اور

زوال کے فیصلے قرآن کے الفاظ میں زمین پر نہیں ہوتے بلکہ آسمانوں پر ہوتے ہیں، اور یہ انسان کی اپنی آزادی اور اختیار کے استعمال کرنے کی روش پر منحصر ہے۔

ذالک بان اللہ لم یک مغیراً نعمۃ انعمھا علیٰ قوم حتّٰی یغیروا ما بانفسھم وان اللہ سمیع علیم۔ (انفال آیت ۵۳)

یہ اللہ کی اس سنت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتی۔

قرآن کے مطابق زوال کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب کہ انسانی زندگی میں خدائی احکامات اور اوامر اور نواہی سے اعراض کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے اور جیسے جیسے یہ کیفیت بڑھتی جاتی ہے زوال میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے اور جب انسان کلی طور پر اپنے آپ کو شیطان کے رستے پر ڈال دیتا ہے تو خدا اس کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور زوال کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ ٹھیک اس کے برعکس خدا کی ذات سے بندے کے تعلقات کی استواری پر عروج کا آغاز ہوتا ہے اور جیسے جیسے اس میں مضبوطی اور پختگی آتی جاتی ہے عروج کی منزلیں بھی ارتقا پذیر ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ولو ان اھل القریٰ اٰمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکٰت من السماء والارض ولٰکن کذّبوا فاخذنٰھم بما کانوا یکسبون۔ (اعراف آیت ۹۶)

اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔ مگر انھوں نے تو جھٹلایا، لہٰذا ہم نے اس بری کمائی کے حساب میں انھیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے

اس باب میں اللہ تعالیٰ جو طریقہ کار اختیار کرتا ہے وہ یہ ہے:

اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اس قوم میں انہی میں سے کسی کو نبی بناتا ہے اور اس کے ذریعہ ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرتا ہے:

یا بنی اٰدم اما یاتینکم رسل منکم یقصون علیکم اٰیٰتی فمن اتقیٰ واصلح فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ (اعراف ۳۵)

اے بنی آدم یاد رکھو، اگر تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایسے رسول آئیں جو تمہیں میری آیات سنا رہے ہوں، تو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنے رویہ کی اصلاح کرے گا اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔

والذین کذبوا باٰیٰتنا واستکبروا عنھا اولٰئک اصحٰب النار ھم فیھا خالدون۔ (اعراف ۳۶)

اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان کے مقابلہ میں سرکشی برتیں گے وہی اہل دوزخ ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

اگر اس قوم کے لوگ نبی کو اور اللہ کی آیات کو جھٹلا دیتے ہیں اور مسلسل ہٹ دھرمی کی روش پر قائم رہتے ہیں تو ان کے دل کو نرم کرنے کے لیے ان کو مختلف آزمائشوں میں ڈالا جاتا ہے:

وما ارسلنا فی قریۃ من نبی الا اخذنا اھلھا بالبأساء والضراء لعلھم یضّرّعون۔ (اعراف آیت ۹۳)

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں نبی بھیجا ہو اور اس بستی کے لوگوں کو پہلے تنگی اور سختی میں مبتلا نہ کیا ہو۔ اس خیال سے کہ شاید وہ عاجزی پر اتر آئیں۔

اگر پھر بھی ان کے اندر عاجزی اور خاکساری پیدا نہیں ہوتی اور وہ اللہ کی طرف مائل نہیں ہوتے تو ان کو مسلسل ڈھیل دی جاتی ہے۔ اس درمیان نبی انتھک جدوجہد کی کوشش کرتا ہے اور ہر طرح سے ان کو ان کے رب کا پیغام سناتا ہے۔ اس درمیان اللہ تعالیٰ ان کی تنگی کو خوشحالی میں بدل دیتا ہے تاکہ مزید آزمائش ہو جائے اور ان کے درمیان اگر کوئی نیک اور سعید روح ہو تو وہ پیغام رب کو قبول کرے اور اس قوم پر حجت تمام ہو جائے۔ اور وہ مدت آ جائے جو ان کے لیے مقرر ہے:

ولکل امۃ اجل فاذا جاء اجلھم لا یستأخرون ساعۃ ولا یستقدمون۔ (اعراف ۳۴)

ہر قوم کے لیے مہلت کی ایک مدت مقرر ہے پھر جب کسی قوم کی مدت آن پوری ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔

پھر اس قوم کو مہلت نہیں دی جاتی، اس کو تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔ اس کی طاقت اور قوت ختم کر دی جاتی ہے۔ اور عذاب کا کوڑا برسا کر اس کو نشانِ عبرت بنا دیا جاتا ہے تاکہ زمین پاک ہو جائے اور اس کی جگہ دوسری صالح قوم کو آگے بڑھنے کا موقع ملے اور زمین سے فتنہ و فساد ختم ہو۔

جب کوئی قوم زوال پذیر ہوتی ہے تو سب سے پہلے اس کی فکر کے زاویے بدلتے ہیں، اس پر دنیا کی محبت غالب آ جاتی ہے، خدا کا خوف اور آخرت میں جواب دہی کا تصور ماند پڑ جاتا ہے، وہ دنیا کمانے میں جٹ جاتی ہے اور حرام و حلال کی تمیز کے بغیر دولت جمع کرنا شروع کر دیتی ہے اس کے اندر سے

صفات علیا ختم ہو جاتی ہیں۔ بہادری، اعلیٰ حوصلگی، اتفاق، ایک دوسرے سے محبت اور دکھ درد میں شرکت ایک ایک صفت رخصت ہو جاتی ہے اور تمام پست خصلتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بزدلی، کم ہمتی، خود غرضی وغیرہ۔ پھر دولت اپنا اثر دکھانا شروع کرتی ہے اور اس کو خرچ کرنے کے لئے شراب، کباب، رقص و سرود کی محفلیں سجنے لگتی ہیں اور وہ قوم تحت الثریٰ میں پہنچ جاتی ہے۔ یہ تبدیلیاں ایک دو عشرے میں نہیں آتیں بلکہ صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک زوال پذیر قوم کو بھی ختم ہونے میں صدیاں گزر جاتی ہیں اور جب یہ عمل مکمل ہو جاتا ہے تو دوسری قومیں اس کو پیس کر رکھ دیتی ہیں اور اس کا نام و نشان مٹ جاتا ہے۔

ہم دوسری اقوام کی تاریخ پڑھنے کے بجائے خود اپنی ہی تاریخ پر کیوں نہ ایک نظر ڈال لیں۔ دورِ نبویؐ کے بعد خلافت راشدہ جو کم و بیش ۲۹ سال (۱۱ھ تا ۴۰ھ) رہی ایک مثالی اور آئیڈیل رفاہی حکومت تھی۔ تاہم حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت زوال کا نقطۂ آغاز تھی۔ اس کا احساس اور ادراک اس وقت ہوا جب حضرت علیؓ کی شہادت ہوئی اور خلافت بادشاہت میں تبدیل ہو گئی اور دنیا آج تک اس دور کی تمنا کرتی رہی مگر کوششوں کے باوجود اس کو واپس نہ لایا جا سکا۔

بنو امیہ، جو خلافت راشدہ کے بعد تخت و تاج کے مالک ہوئے اور ۴۱ھ سے ۱۳۲ھ تک ایک بڑے علاقے کے حکمران رہے۔ جب زوال سے دوچار ہوئے تو ان میں وہ تمام اسباب پیدا ہو گئے تھے جہاں پہنچ کر ایک قوم یا خاندان ختم ہو جاتا ہے۔ بنو امیہ کے آخری دور میں خواجہ سراؤں، کنیزوں اور لونڈیوں کا استعمال بڑھ گیا تھا۔ شراب نوشی، موسیقی اور رقص کو ثقافت کا مقام حاصل ہو گیا تھا اور اس کی سرپرستی امراء اور سلاطین کر رہے تھے۔ (ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ ص۱۳۱، ج ۱)

ان کے علاوہ سب کے سب عیش پرست، پست ہمت، تن آسان اور عقل و بصیرت سے نا آشنا تھے اور ہرگز اس قابل نہ تھے کہ ایسی بڑی شہنشاہی کے فرمانروا ہوں جیسی کہ بنو امیہ کی خلافت تھی۔ اسلام نے اگرچہ موسیقی اور شراب نوشی کو مٹا دیا تھا لیکن انہیں خلفاء بنو امیہ نے ان دونوں ناپسند اور مضر چیزوں کو پھر رواج دیا جن کا سلسلہ آج تک مسلمانوں میں موجود پایا جاتا ہے۔ (تاریخ اسلام ج ۲ ص ۲۳۹)

خلافت عباسیہ کا آخری دور اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے بدترین دور کہا جا سکتا ہے۔ اس کے حکمران عیش پسند، شراب و کباب اور عورتوں کے رسیا ہو گئے تھے۔ محفلِ رقص و سرود ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ نتیجۃً وہ محکومی کے شکار ہو گئے۔ اندلس کی اسلامی سلطنت ہو یا ہندوستان کی مغلیہ حکومت، اخلاقی

حیثیت سے جب وہ بالکل گر گئیں تو تباہی اور عذاب برس پڑا اور ان کو اپنے علاقوں سے اکھاڑ پھینکا گیا۔ یقیناً اب وہ اس لائق نہیں تھیں کہ ان کو موقع دیا جاتا اور زمین کو کچھ اور دنوں تک ان کے منحوس وجود سے تاریک رکھا جاتا۔

آج مسلمانوں کے جس مجموعہ کو ہم ملت اسلامیہ سے تعبیر کرتے ہیں قوموں کے عروج و زوال میں ترقی و تنزل کے اعتبار سے اس کا جو مقام ہونا چاہیے وہی مقام اس کو ملا ہوا ہے، اس سے نہ کچھ کم ہے اور نہ کچھ زیادہ۔ اللہ تعالیٰ اپنی سنت اور اپنے طریق کار کو بدل نہیں سکتا جب تک کہ یہ خود اپنے آپ کو بدل نہیں لیتے۔ اور اگر ایمان، اسلام، خدا اور رسول سے جو معمولی سا رشتہ باقی رہ گیا ہے اس کو بھی توڑ دیں تو ان کی نیست و نابود ہونا یقینی ہے۔ پھر تاریخ میں یہ صرف عبرت کیلئے باقی رہیں گے اور دوسری کوئی قوم آگے بڑھ کر دنیا کی رہنمائی کی ذمہ داری لے گی۔ مسلم ملت کے ایک فرد کے لئے یہ انتہائی غور و فکر کا مقام ہے۔

قرآن کی ایک مختصر سی سورۃ میں عروج کی وہ صفتیں بیان ہوئی ہیں جن کو اختیار کر کے کوئی قوم عروج و ارتقاء کی منزلیں طے کر سکتی ہے " وَالْعَصْرِ ۝ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ " (سورۃ والعصر) "زمانے کی قسم، انسان درحقیقت خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی تلقین اور صبر کی تلقین کرتے رہے"۔

۱۔ ایمان، ۲۔ عمل صالح، ۳۔ امر بالمعروف، نہی عن المنکر (تواصی بالحق)، ۴۔ حق پر جماؤ و ثابت قدمی (باطل کے مقابلے میں)، یہ چار صفتیں ہیں جو عروج کی ضمانت ہیں۔ ان کو کوئی فرد اختیار کرے یا خاندان، گروہ یا امت، یقیناً عروج کی منزلیں اس کے قدم چومیں گی اور ان صفات میں وہ جتنا زیادہ پختہ ہو گا اس کی ارتقاء کی منزلیں بھی اتنی ہی بلند ہوں گی۔ کاش ایک بار پھر ہم ان صفتوں کو اپنا لیتے ...... ! سہ

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

طارق ماجد باجوہ
۳۱-۸-۱۹۹۶

مولانا جلیل احسن ندویؒ

اصحابِ اعراف کون ہیں؟

سورہ اعراف آیت ۴۶ تا ۴۹ (وبینہما حجاب ــــــ ولا انتم تحزنون)

ان آیتوں کا ترجمہ اصلاحی پڑھیے۔

"اور ان کے درمیان پردے کی دیوار ہوگی، اور دیوار کی برجیوں پر کچھ لوگ ہوں گے جو ہر ایک کو ان کی علامت سے پہچانیں گے اور وہ اہل جنت کو پکار کر کہیں گے کہ آپ پر اللہ کی رحمت و سلامتی ہو، وہ اس میں ابھی داخل نہیں ہوں گے لیکن متوقع ہوں گے۔ اور جب ان کو اہل دوزخ کیطرف توجہ دلائی جائیگی، وہ پکار اٹھیں گے اے ہمارے رب ہمیں ان ظالموں کا ساتھی نہ بنائیو!

اور برجیوں والے کچھ اشخاص کو جن کو وہ ان کی علامت سے پہچانتے ہوں گے آواز دیں گے۔ کہیں گے کہ کام آئی تمہاری جمعیت اور تمہارا وہ سارا گھمنڈ جو تم کرتے تھے کیا یہی ہیں وہ لوگ جن کے باب میں تم قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ یہ کبھی اللہ کی کسی رحمت کے سزاوار نہیں ہو سکتے داخل ہو جنت میں اب نہ تم پر کوئی خوف ہے اور نہ تمہیں کوئی غم لاحق ہوگا۔ (تدبر دوم صفحہ ۲۲۸، ۲۲۹)

ترجمہ پر تھوڑی سی گفتگو کرنی ضروری ہے، پہلی آیت ۴۶ میں ایک لفظ حجاب آیا ہے جن کا ترجمہ مولانا نے "پردے کی دیوار" سے کیا ہے، حجاب کے معنی اوٹ اور روک کے ہیں یعنی وہ چیز جو دو آدمیوں یا دو گروہوں کے درمیان حائل ہو جائے، دیوار بھی حائل ہو جائے تو اسے حجاب سے تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن یہاں دیوار کے لئے کوئی قرینہ نہیں ہے اور مولانا نے سورہ حدید آیت ۱۳ میں آئے ہوئے لفظ "سُوْرٌ" کو قرینہ بنایا ہے تو وہاں سُوْرٌ سے جنت کی بلند ترین فصیل مراد ہے نہ کہ وہ دیوار جو جنت اور جہنم کے درمیان کھڑی کی جائے گی، اور جنتی فصیل کیلئے واضح ترین قرینہ "بِسُوْرٍ" کے بعد اس کی صفت کے طور پر آنے والا جملہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "منافقین اور مخلص اہل ایمان کے درمیان میں بلند فصیل حائل ہو جائے گی جس کا ایک ہی پھاٹک ہے، مومنین پھاٹک کے اندرونی حصے میں چلے جائیں گے جہاں رحمت ہی

رحمت ہے ٹھنڈک ہی ٹھنڈک ہے اور فصیل کے باہر عذاب ہی عذاب ہے اس طرح مومنین اور منافقین کے بیچ میں جنتی فصیل حائل ہو جائے گی۔ اہل ایمان کیلئے پھاٹک کھلا جنتی داخل ہوئے اور فوراً پھاٹک بند ہوا۔

اعراف جمع ہے عرف کی جس کے معنی بلند جگہ کے ہیں، اس سے جنت اور جہنم کے درمیان کھڑی کیجانے والی دیوار کی برجیاں مراد نہیں ہیں بلکہ میدان حشر کی بلند جگہ مراد ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرات انبیاء علیہم السلام مومنین اور دشمنان دین کو خطاب کریں گے مومنین کیطرف رخ کر کے انہیں مبارکباد دیں گے، رحمت خداوندی کی خوشخبری دیں گے، دنیا میں بھی اہل ایمان کو خوشخبری سنا کر ان کے زخموں پر پھایا رکھتے تھے، سورہ انعام آیت میں خدا اپنے نبی کو حکم دیتا ہے کہ

"جب اہلِ ایمان ستائے گئے، اے نبی، تمہارے پاس آئیں تو انہیں سلامتی اور رحمت کا مژدہ سناؤ ان سے کہو کہ تمہارے رب نے طے کر دیا ہے، دستاویز کی شکل میں، کہ وہ تمہیں اپنی رحمت سے نوازے گا وہ قیامت کے دن اپنے انعام بے کراں سے نوازنے کیلئے تم کو جمع کریگا"

چنانچہ جسطرح دنیا میں اہل ایمان کو بشارت دیتے تھے، اسی طرح وہاں بشارت دیں گے یہاں یہ بات یاد رہے کہ اہل ایمان اور اہل کفر ابھی محشر میں ہیں یہ جنت میں اور وہ جہنم میں نہیں گئے ہیں، البتہ دونوں گروہوں کے ٹھکانے کا فیصلہ ہو چکا ہے، اسی لئے نبی کی بشارت کے بعد اللہ نے فرمایا "لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ" (اہل جنت ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے البتہ داخلہ کے شدید آرزو مند ہیں)

وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ والے جملہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو توجہ دلائی جائے گی کہ ذرا ایک نظر دشمنان حق کے انجام پر ڈال لیجئے بلکہ صحیح مطلب یہ ہے کہ ان معاندین کو شدید نفرت کی بنا پر دیکھنے کو ان کا جی تو نہ چاہے گا مگر مجبوراً ان کی طرف تاکیں گے کیونکہ انہیں خطاب کرنا ہے، وہ کہیں گے اے ہمارے رب ہمارا حشر ان لعنتیوں جیسا نہ کر، ہمیں ان کی معیت نہ دے، ہمیں ان ظالموں کی فہرست میں نہ شامل کیجیو، یہ انتہائی نفرت کا کلمہ ہے، دنیا میں بھی نبی یہی دعا کرتے تھے، رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ

سورہ مومنون آیت ۹۳) یعنی تکذیب کے نتیجہ میں ان پر جو عذاب آنے والا ہے اس سے ہمیں محفوظ رکھیو۔

جیسا کہ ہماری اوپر کی تقریر سے واضح ہوا رجال سے انبیاء علیہم السلام مراد ہیں یہ اپنے زمانے کے لوگوں کو خوب پہچانتے ہوں گے۔ اہل ایمان کو بھی اور اولیاء الشیطان کو بھی، مظلوم اہل حق کو بھی ظالم اہل باطل کو بھی، اہل باطل کے سرداروں کو بھی، باطل پرست عوام کو بھی۔ بعد کی آیتوں میں لیڈروں کو خطاب کر رہے ہیں چنانچہ ان سے کہیں گے کہو تمہاری جمعیت کہاں گئی۔ تمہارے کچھ کام آئی؟ وہ اور کہاں گیا تمہارا اقتدار اور معاشی خوشحالی جس کے بل پر تم اکڑ رہے تھے، اور تحقیر و تضحیک کرتے ہوئے جو اہل ایمان کا مذاق اڑاتے تھے، کہتے تھے خدا ان کو اپنی ذرا سی رحمت سے بھی نہیں نوازے گا۔ دیکھو کس طرح خدا کی رحمت سے نوازے گئے، اور فوراً مومنین سے کہیں گے چلو اب جنت میں جا بسو اب خوف اور غم کا یک قلم خاتمہ ہوا ہمیشہ کیلئے!

مولانا نے ابن جریرؒ کی اتباع میں 'رجال' سے علماء اور فقہاء مراد لیا ہے۔ ہم نے ان علماء تفسیر کی اتباع کی ہے جن کی رائے یہ ہے کہ یہاں انبیاء مراد ہیں، اور مجھ حقیر طالب علم کی رائے یہ ہے کہ یہاں انبیاء کا ماجرا بیان ہو رہا ہے۔ علماء اور فقہاء یعنی حاملانِ حق کا نہیں جس ڈھنگ سے یہاں بات بیان ہو رہی ہے وہ علماء اور فقہاء پر منطبق نہیں ہوتی اگرچہ امام المفسرینؒ نے اسے ترجیح دی ہے، اور مولانا اصلاحی صاحب نے اسے خوبصورت ڈھنگ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ قرآن کے طلبہ دونوں رایوں کو پڑھیں، قرآنی الفاظ سے جو اوفق نظر آئے اسے اختیار کریں۔

بقیہ۔ صبر

صبر ہو تو اس کا نام قناعت ہے اور اس کی مخالف حالت کا نام شرہ ہے۔ اس بات سے معلوم ہوا کہ اکثر اخلاق ایمانی صبر میں داخل ہیں اسی لئے ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا ھو الصبر (الایمان الصبر) یہ بات ایسی ہے جیسے ایک بار آپؐ نے حج کے بارے میں فرمایا الحج عرفۃ (حج وقوف عرفہ کا نام ہے) یعنی عرفات کا قیام حج کا سب سے بڑا رکن ہے کہ یہ فوت ہو جائے تو حج ہی فوت ہو جائے گا۔

پہلی قسط

مولانا سید عروج قادری

صَبْر

صبر کے لغوی معنی روکنے کے ہیں یعنی کسی کو کسی چیز سے روک دینا۔ شرعی اصطلاح کے لحاظ سے صبر اس قوت، کیفیت اور حالت کا نام ہے جو انسان کو نفسانی خواہشات پر چلنے اور شیطانی مطالبات کو ماننے سے روک دیتی ہے۔ امام غزالیؒ نے بڑی مفید ترتیب کے ساتھ نہایت عالمانہ و عارفانہ انداز میں صبر کی حقیقت بیان کی ہے۔ ہم یہاں اس کی تلخیص پیش کر رہے ہیں:

صبر مقاماتِ دین میں سے ایک مقام اور رہروانِ راہِ حق کی منزلوں میں سے ایک منزل ہے۔ دین کے جتنے مقامات ہیں ان کی تنظیم تین امور سے ہوتی ہے۔ ۱ معارف، ۲ احوال، ۳ اعمال۔ معارف اصول کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے احوال پیدا ہوتے ہیں اور احوال کا ثمرہ اعمال ہوتے ہیں۔ اس کو یوں سمجھو کہ معارف (علوم) درخت ہیں، احوال شاخیں ہیں اور اعمال پھل ہیں۔ صبر کی تنظیم بھی تین امور سے ہوتی ہے۔ صبر سے پہلے بہت سی چیزوں کا علم و یقین ضروری ہے۔ اسی سے ایک باطنی حالت پیدا ہوتی ہے اور اسی حالت کا پھل ہے جسے ہم صبر کہتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ کی جاندار مخلوق میں صبر صرف انسان کا خاصہ ہے۔ یہ جانوروں میں نہیں پایا جاتا اور نہ فرشتوں کو اس کی ضرورت ہے۔ جانور مکلف مخلوق نہیں ہیں اس لئے ان کے لئے شرعی اوامر و نواہی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ انہیں صبر کی ضرورت پیش آئے۔ فرشتے طاعت امر الٰہی کے مکلف ضرور ہیں لیکن ان پر ایسی کوئی خواہش نفس مسلط نہیں کی گئی ہے جو انہیں اطاعت سے روکے، اس لئے انہیں بھی صبر کی ضرورت نہیں ہے۔ صبر انسان کی خصوصیت اس لئے ہے کہ اس میں ملکیت اور بہیمیت جمع کر دی گئی ہے اور اس کے لئے یہ اوامر و نواہی دونوں کا مکلف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ دو فرشتے مقرر کئے ہیں۔ ان میں سے ایک اسے رہِ راست

دکھا دیتا ہے اور دوسرا اس کو تقویت پہنچاتا ہے۔ انسان کو اللہ و رسول کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور اسے ان مصالح کا علم بھی دیا گیا ہے جن کا تعلق نتائج و عواقب سے ہے اور اسے اپنے ہر فعل کے بارے میں یہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی گئی ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ اسی نور ہدایت سے انسان کو یہ معرفت حاصل ہوتی ہے کہ خواہشات و شہوات کی پیروی کے نتائج نہایت خراب ہیں لیکن یہ معرفت کافی نہیں ہے جب تک اسے ایسی قوت و قدرت بھی حاصل نہ ہو جس کے ذریعے وہ مضر چیزوں سے اپنے آپ کو بچا سکے۔ اسی ضرورت کی بنا پر اللہ نے اس کو ایک ایسی قوت دی ہے جس سے وہ مضر خواہشات کے منہ میں لگام ڈال سکتا ہے اور ان سے رک سکتا ہے۔ اللہ نے دوسرا فرشتہ اسی لیے مقرر کیا ہے کہ وہ اس لڑائی میں ایسے لشکروں سے انسان کی مدد کرے جنھیں آنکھیں نہیں دیکھتیں۔ یہ لشکر شہوت کے لشکر سے جنگ کرتا ہے اور یہ جنگ مسلسل جاری رہتی ہے۔

ہم اس صفت کا نام باعث دینی رکھتے ہیں جس کی وجہ سے انسان خواہشات کی شکست دیکھتا یا جانوروں سے ممتاز ہے یعنی یہ ایک ایسا دینی محرک جو انسان کو احکام دین کی تعمیل پر ابھارتا ہے۔ اسی طرح ہم خواہشات اور ان کے مقتضیات کا نام باعث ہوائی رکھتے ہیں۔ یعنی ایک ایسا نفسانی محرک جو انسان کو احکام دین کی خلاف ورزی پر ابھارتا ہے۔ اس محرک دینی اور محرک نفسانی کے درمیان جنگ چھڑی رہتی ہے اور اس جنگ کا میدان انسان کا قلب ہے۔ محرک دینی کی مدد فرشتوں کا وہ لشکر کرتا ہے جو حزب اللہ کی مدد کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور محرک نفسانی کی مدد شیاطین کی فوج کرتی ہے جس کا کام دشمنان خدا کی تائید و حمایت ہے۔ اب صبر کی حقیقت بتانے کا وقت آگیا تو سمجھو کہ صبر نام ہے محرک شہوت کے مقابلے میں محرک دینی کے ثبات و استقامت کا۔ اگر محرک دینی محرک شہوت پر غالب آجائے تو انسان صابرین کے گروہ میں داخل ہو جاتا ہے اور اگر مغلوب ہو جائے تو حزب شیطان میں جا گھستا ہے۔ اب اوپر کی ترتیب کے لحاظ سے یوں سمجھو کہ خواہش نفسانی کے مطابق افعال کا ترک کرنا وہ عمل ہے جو عادت صبر کا پھل ہے اور یہ حالت اس علم و یقین سے پیدا ہوتی ہے کہ خواہشات نفسانی کی پیروی انسان کے لئے دنیا اور آخرت دونوں ہی جگہ

مضرت رساں ہے۔ یہ علم و یقین جتنا قوی ہوگا اسی کی نسبت سے وہ حالت قوی ہوگی جسے ہم نے صبر کہا ہے اور پھر اسی کی قوت کے اعتبار سے خواہشات نفسانی کے مقابلے میں کامیابی ہوگی۔ [1]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ صبر کے بغیر نہ تو انسان اطاعت میں مجاہدہ کر سکتا، نہ اسے حزب الشیطان کے مقابلے میں فتح حاصل ہو سکتی، اور نہ اسے تقویٰ کی نعمت مل سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بار بار صبر اور کثرت سے استعانت طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

صبر کی فضیلت

امام قشیری، امام غزالی، امام نووی، شیخ الاسلام انصاری اور سید مصطفیٰ عروسی نے صبر کی فضیلت میں متعدد آیتیں پیش کی ہیں۔ ہم یہاں احیاء العلوم سے آیتیں پیش کر رہے ہیں۔ امام غزالی نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے متعدد اوصاف کے ساتھ صابرین کا ذکر کیا ہے اور قرآن میں ستر سے زیادہ مقامات پر صبر کا ذکر ہے۔ اور اکثر درجات و خیرات کو اللہ تعالیٰ نے صبر کی طرف منسوب کیا ہے اور انھیں اسی کا ثمرہ قرار دیا ہے۔ اس سلسلے کی چند آیتیں یہ ہیں:

(۱) وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا ۖ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ ۝ (السجدہ ع ۳)	اور جب انھوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین لاتے رہے تو ان کے اندر ہم نے ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے۔
(۲) وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا ۔ (الاعراف ع ۱۶)	اور بنی اسرائیل کے حق میں تیرے رب کا وعدہ خیر پورا ہو کیونکہ انھوں نے صبر سے کام لیا
(۳) وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُوا أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (النحل ع ۱۳)	اور ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے۔
(۴) أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ	یہ وہ لوگ ہیں جن کا اجر دوہرا دیا جائے گا اس

[1] احیاء علوم الدین۔ ج ۴۔ بیان حقیقۃ الصبر

بِمَا صَبَرُوْا۔ (القصص ع ۶)　　صبر کے بدلے جو انھوں نے دکھایا۔

(۵) اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ　　صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب
بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ (الزمر ع ۲)　　دیا جائے گا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر نیکی کا جر ایک اندازے اور حساب کے مطابق ملتا ہے صبر کے سوا۔ روزہ چونکہ صبر ہی کی ایک مخصوص قسم ہے اس لئے روزے کے بارے میں بھی حدیث قدسی میں فرمایا گیا ہے الصوم لی وانا اجزی بہ (روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا) اللہ نے روزے کو تمام عبادات کے درمیان اپنی طرف منسوب کیا، حالانکہ تمام عبادتیں اسی کے لئے ہیں۔ اسی طرح اس نے اس کے اجر کو بھی اپنی طرف منسوب کیا، حالانکہ تمام نیکیوں کا اجر وہی عطا کرے گا۔ اس نسبت سے صبر کی بڑی فضیلت نکلتی ہے۔

اسی طرح اللہ نے صابروں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کے ساتھ ہے:

(۶) وَاصْبِرُوْا، اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۝　　اور صبر کرو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے
(الانفال ع ۶)　　ساتھ ہے۔

اللہ نے اپنی نصرت اور مدد کو بھی صبر پر معلق کیا ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہے:

(۷) بے شک اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمہارے اوپر چڑھ کر آئیں گے اس آن تمہارا رب پانچ ہزار صاحب نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔ (آل عمران ع ۱۳)

اس نے صابروں کے لئے چند نعمت کو ذیل کی آیت میں یکجا ذکر کیا ہے جو دوسروں کے لئے نہیں کیا ہے:

(۸) اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ　　ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں
رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ　　گی، اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی اور یہی
الْمُهْتَدُوْنَ۝ (البقرہ ۱۹۶)　　لوگ راست رو ہیں۔

ہدایت، رحمت اور صلوات کو یہاں صابرین کے لئے جمع کر دیا گیا ہے۔ مقام صبر کے بارے میں تمام آیتوں کا استقصاء موجب طوالت ہے۔ [1]

---

[1] احیاء علوم الدین۔ ج ۴، بیان فضیلۃ الصبر

چند احادیث

(۱) ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلۂ انصار کے کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، آپ نے انھیں عطا فرمایا، پھر سوال کیا اور پھر عطا فرمایا۔ یہاں تک کہ آپ کے پاس جو کچھ تھا وہ ختم ہو گیا۔ جب آپ نے اپنے پاس کا سب مال صرف کر دیا تو ان سے فرمایا میرے پاس جو مال آتا ہے وہ میں تم سے بچا کر نہیں رکھتا اور جو شخص اللہ سے عفت چاہتا ہے، اللہ اسے عفیف بنا دیتا ہے اور جو استغنا طلب کرتا ہے اس کو مستغنی بنا دیتا ہے اور جو کوشش کر کے صبر اختیار کرتا ہے اللہ اسے صابر بنا دیتا ہے۔ اور کسی کو صبر سے بہتر اور وسیع تر عطیہ نہیں دیا گیا۔ [1]

یہ متفق علیہ حدیث وسیع معانی اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ اس میں یہ تو ہے ہی کہ صبر اللہ تعالیٰ کا بہترین اور وسیع ترین عطیہ ہے، اسی کے ساتھ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ عفت، غنائے قلب اور صبر جیسی اعلیٰ صفتیں یونہی حاصل نہیں ہوتیں بلکہ ان کے لئے عزم و ارادہ، اللہ سے دعا اور مشقت و محنت کی ضرورت پڑتی ہے۔

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں جب کسی بندے کے مخلص اور جگری دوست کو دنیا سے اٹھا لیتا ہوں اور وہ جزع فزع نہیں کرتا بلکہ اجر و ثواب کا طالب رہتا ہے تو میرے پاس ایسے بندے کا اجر جنت ہے۔ [2]

(۳) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے طاعون کے بارے میں سوال کیا، آپ نے خبر دی کہ یہ عذاب الٰہی ہے وہ جس پر چاہتا ہے اسے بھیجتا ہے اور اس کو اس نے مومنوں کے لئے رحمت بنایا ہے۔ جو مومن کسی ایسی جگہ ہو جہاں طاعون پھیل گیا اور وہ اس جگہ صبر کے ساتھ اللہ سے اجر طلب کرتا ہوا پڑا رہے۔ اسے یقین حاصل ہو کہ اس کو وہی مصیبت پہنچ سکتی ہے جو اللہ نے اس کے لئے لکھ دی ہے، تو اس بندے کو ایسا اجر ملتا ہے جیسے ایک شہید کو ملتا ہے۔ [3]

(۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ

---

[1] ریاض الصالحین بحوالہ بخاری و مسلم۔　[2] ریاض الصالحین بحوالہ بخاری
[3] ایضاً بحوالہ بخاری

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میں اپنے کسی بندے کی دونوں آنکھیں لے کر اسے آزمائش میں مبتلا کرتا ہوں اور وہ صبر کرتا ہے تو ان آنکھوں کے عوض میں اسے جنت دوں گا۔ ۱؎

(۵) عطا ابن رباح کہتے ہیں کہ مجھ سے ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا، کیا میں تمہیں ایک جنتی عورت نہ دکھاؤں؟ میں نے کہا ہاں۔ انھوں نے ایک کالی کلوٹی عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور کہا کہ مجھ پر مرگی کا دورہ پڑتا ہے اور میرا ستر کھل جاتا ہے۔ آپ میرے لئے اللہ سے دعا فرمادیں۔ آپؐ نے فرمایا اگر تم چاہو تو صبر کرو تمھیں جنت ملے گی اور اگر تم چاہو تو میں اللہ تعالیٰ سے تمہاری صحت و عافیت کے لئے دعا کر دوں۔ انھوں نے (صبر اور جنت کو اختیار کرتے ہوئے) کہا کہ آپ بس اتنی دعا فرما دیجئے کہ میرا ستر نہ کھلا کرے۔ آپؐ نے ان کے لئے یہ دعا فرمادی۔ ۲؎

(۶) ابو ابراہیم عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، بعض غزوات میں جس میں دشمن سے مڈبھیڑ ہوئی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتظار فرمایا یہاں تک کہ جب سورج ڈھل گیا تو آپؐ نے لشکر کے درمیان کھڑے ہو کر فرمایا۔ اے لوگو! دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو۔ اللہ سے عافیت کی دعا کرو، لیکن جب مڈبھیڑ ہو جائے تو صبر کرو اور یقین رکھو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے۔ ۳؎

چند آثار

(۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو ایک خط میں لکھا کہ:
تم صبر کو اپنے اوپر لازم کر لو اور جان لو کہ صبر دو طرح کے ہوتے ہیں ان میں کا ایک دوسرے سے افضل ہے، مصیبتوں پر صبر بہتر ہے لیکن اس سے افضل صبر وہ ہے جو ممنوعات و محرمات سے کیا جاتا ہے اور جان لو کہ صبر وہ چیز ہے جس پر ایمان کا قیام ہے۔ اور یہ اس لئے کہ تقویٰ سب سے افضل نیکی ہے اور تقویٰ صبر ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ ۴؎

(۲) حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کہا ہے کہ ایمان کی بنیاد چار ستونوں پر قائم ہے۔ یقین، صبر، جہاد، عدل۔ انھیں نے یہ بھی کہا ہے کہ صبر کو ایمان کی نسبت سے وہی مقام حاصل ہے جو جسم میں سر کو حاصل ہے۔ جس کا سر نہیں اس کا جسم نہیں اور جس میں صبر نہیں اس میں ایمان نہیں۔ ۵؎

۱؎ ریاض الصالحین بحوالہ بخاری۔ ۲؎ ایضاً بحوالہ بخاری و مسلم۔ ۳؎ ایضاً
۴؎ احیاء علوم الدین جلد ۴۔ ۵؎ ایضاً

(۳) حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ ایمان کی اونچی چوٹی اللہ کے حکم پر صبر اور قضاء و قدر سے رضامندی ہے۔ ۱؎

(۴) حضرت حبیب ابن حبیب جب یہ آیت پڑھتے اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۚ نِعْمَ الْعَبْدُ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ۝ (ہم نے اسے صابر پایا وہ اچھا بندہ ہے بے شک وہ اللہ کی طرف بہت رجوع کرنے والا ہے) تو رونے لگتے تھے اور کہتے تھے سبحان اللہ، اسی نے صبر دیا اور اسی نے تعریف کی۔ ۲؎

ان آیات، اخبار و آثار سے صبر کی فضیلت اور دین میں اس کی اہمیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

صبر کی متعدد قسمیں

عام طور سے صبر کی تین قسمیں کی جاتی ہیں (۱) طاعات و عبادات پر صبر (۲) مصائب و آلام پر صبر (۳) ممنوعات و محرمات سے صبر۔ پھر انسان کے حالات کے لحاظ سے اس کی دو قسمیں اور ہوتی ہیں۔ انسان کی ایک حالت تو وہ ہے جو اس کی طبیعت اور خواہش کے موافق ہوتی ہے مثلاً صحت، امن و سلامتی، مال و جاہ، ساز و سامان کی وسعت، اعوان و انصار کی کثرت، افراد خاندان کی کثرت اور اسی طرح دنیا کی دوسری لذتیں اور عافیتیں اور انسان کی دوسری حالت وہ ہے جو اس کی طبیعت اور خواہش کے ناموافق ہوتی ہے مثلاً بیماری، خوف و خطر، تنگ دستی، بے کسی و بے چارگی اور اسی طرح دنیا کی دوسری تکلیفیں اور مصیبتیں۔ پہلی حالت میں طاعات و عبادات پر صبر اور ممنوعات و محرمات سے صبر کا درجہ بہت بڑا ہے کیونکہ اس حالت میں نفس پر قابو رکھنا دوسری حالت کے مقابلے میں زیادہ مشکل کام ہے۔ صحت کی ہوا اور ساتھ ہی مال و دولت اور جاہ و مرتبہ بھی حاصل ہو تو انسان خواہش نفس کی پیروی اور حد کی خلاف ورزی پر اتر آتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس حالت کو پہنچ جاتا ہے جس کو دینی اصطلاح میں بطر و طغیان کہتے ہیں۔ اور اسی حالت کی طرف سورۃ العلق کی اس آیت میں اشارہ ہے: كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝ (بے شک انسان اپنی حد سے نکل جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے)۔ اسی وجہ سے صوفیہ اور علماء نے کہا ہے: الصبر علی العافیۃ اشد من الصبر علی البلاء (عافیت پر صبر، بلا پر صبر سے زیادہ دشوار ہے)۔ جب متوکل باللہ نے اپنے دور حکومت میں امام احمد بن حنبل کو انعام و اکرام سے نوازنا چاہا تو انھوں نے فرمایا تھا کہ یہ آزمائش کوڑوں کی

۱؎ احیاء علوم الدین جلد ۴۔ ۲؎ ایضاً

آمدنی سے زیادہ سخت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن اور حدیث میں مسلمانوں کو مال اور اولاد کے فتنے سے بار بار ڈرایا گیا ہے کہ کہیں مال کی قوت اور ماتحتی کا زور انھیں سرکشی نہ بنا دے۔ امام غزالیؒ لکھتے ہیں کہ مرد کامل وہ ہے جو عافیت پر صبر کرتا ہے، اور اس پر صبر کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کی چیزوں کو دل میں جگہ نہ دے۔ انھیں مستعار کی امانت جانے اور یہ بھی خیال رکھے کہ دولت چھین لی جاتی ہے، وہ تنعم ولذت، عیش وعشرت اور لہو و لعب میں منہمک نہ ہو۔ اللہ نے اس کے مال میں جو حقوق مقرر کیے ہیں، مال خرچ کرکے وہ انھیں ادا کرے۔ اس کے بدن میں جو صحت وقوت دی گئی ہے اسے مخلوق کی مدد میں صرف کرے، اپنی زبان کو جھوٹ سے آلودہ نہ کرے۔ غرض اللہ نے جو نعمت وقوت بھی اسے دے رکھی ہے اسے اس کی اطاعت میں لگائے۔ یہ وہ صبر ہے جس کا ڈانڈا شکر سے مل جاتا ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ اس حالت کے صبر کو افضل کہنے کی وجہ یہ ہے کہ فقر وافلاس اور ضعف ومرض کی حالت کے مقابلے میں، اس شخص کو گناہوں، خدا کی نافرمانیوں پر زیادہ قدرت حاصل ہوتی ہے، اور اسی پہلو سے اس حالت کے صبر کو افضل کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عافیت وقوت کا صبر مطلقاً افضل ہے، اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ مصائب پر صبر کوئی ادنیٰ درجے کی چیز ہے۔ مصائب پر صبر کی فضیلت میں اوپر چند حدیثیں نقل کی گئی ہیں اور اگر اس ذیل کی تمام حدیثیں جمع کی جائیں تو ان کی تعداد کثیر ہوگی۔

صبر کے مختلف نام

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ جس چیز پر صبر ہو اور جس چیز سے صبر کرنا ہو ان کی نسبت واضافت سے صبر کے مختلف نام ہو جاتے ہیں مثلاً پیٹ اور شرمگاہ کو حرام اور مکروہ سے بچانے میں صبر ہو تو اس کا نام عفت ہے۔ اور صحت، قوت اور فارغ البالی کی حالت میں صبر کا نام ضبط نفس ہے اور اس کی مخالف ومتضاد حالت کا نام بطر ہے۔ اگر صبر جنگ اور مقابلہ کی حالت میں ہو تو اس کا نام شجاعت ہے اور اس کی مخالف حالت کا نام بزدلی۔ اگر غیظ وغضب کی حالت میں صبر ہو یعنی انسان غصہ پی جائے تو اس کا نام حلم ہے، اور اس کی مخالف حالت کو تند مزاجی کہتے ہیں۔ اگر آفات سماوی وارضی کی حالت میں ہو تو اس کا نام سعۃ الصدر (کشادہ دلی) ہے اور اس کی مخالف حالت کا نام ضجر اور ضیق صدر (تنگ دلی) ہے۔ اگر کسی کے راز کو مخفی رکھنے میں صبر ہو تو اس کا نام کتمان السر (اخفائے راز) ہے۔ اگر مباحات اور غیر ضروری سامان عیش وعافیت سے صبر ہو تو اس کا نام زہد ہے اور اس کی مخالف حالت کا نام حرص وطمع ہے۔ اگر کم سامان زندگی پر

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

قرآن کا اسلوب دعوت

عبید اللہ فہد
شعبہ سیاسیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

معاشرتی مسائل سے تعرض

"مضمون کی تمام جزئیات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں"

(قرآن کے اسلوب دعوت پر راقم کا ایک مضمون دو قسطوں میں "زندگی نو" دسمبر ۱۹۹۲ء، دسمبر ۱۹۹۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ زیر نظر مضمون اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے)

قرآن نے عقائد وعبادات کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ مخاطب قوم کے معاشرتی مسائل سے تعرض بھی کیا اور انھیں اصل نصب العین کی تفہیم وتوضیح کے لیے استعمال کیا۔ ظاہر ہے کہ اسلام کوئی مابعد الطبیعیاتی یا مافوق الفطرت مذہب نہیں ہے جو محض آسمانی بادشاہت کی خوشخبری سناتا ہو اور دنیا کے مسائل کو قیصر کے حوالے کر دیتا ہو بلکہ یہ دین فطرت ہے اور فطرت پر پیدا ہونے والے انسان کے جملہ مسائل سے بحث کرتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے معاشرتی مسائل سے تعرض نہ کیا ہوتا بلکہ آخرت کی تذکیر، تلقین اور عبادات کی تعلیم پر بس کیا ہوتا تو مشرکین مکہ کی مخالفانہ سرگرمیاں اپنے شباب کو نہ پہنچتیں۔ یہی وجہ ہے کہ دعوت کی ابتدا ہی سے تحریک نبوی کے سامنے یہ چیز واضح تھی اور ظلم وجبر کے ماحول میں بھی آپ نے نظام معاشرت وتمدن کو نظام قسط کے سانچے میں ڈھالنے کا عزم مسلسل جاری رکھا۔ بالکل ابتدائی مرحلہ میں خاندان بنی ہاشم کی ضیافت کے

موقع پر آپ نے اجمالاً دین و دنیا کی بھلائی کی ضمانت دینے والی دعوت کیطرف انہیں بلایا تھا۔

(۱) فإن تقبلوا مني ما جئتكم به فهو حظكم في الدنيا والآخرة — (اگر وہ دعوت قبول کرو جو میں پیش کر رہا ہوں تو اسمیں تمہاری دنیا وآخرت دونوں کی بھلائی ہے)

ایک اور موقع پر آپ سے جب گفت وشنید ہوتی ہے تو دو ٹوک انداز میں اپنی دعوت پیش کر دیتے ہیں۔

(۲) كلمة واحدة تعطونيها تملكون بها العرب وتدين لكم بها العجم — بس ایک کلمہ ہے اگر اسے قبول کرو تو اس کے ذریعہ تم سارے عرب پر حکمرانی کرو گے اور عجم تمہارے پیچھے چلے گا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن اصول مبادی کی تعلیم دینے کے ساتھ معاشرتی، سیاسی ومعاشی مسائل پر بھی توجہ دلاتا ہے وہ ان انبیاء کی تاریخ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جنہوں نے وقت کے مسائل سے دلچسپی لی اور انہیں دعوت دین کیلئے وسیلہ بنایا بلکہ ایسے پیغمبروں کی سیرت بھی ہمارے سامنے رکھتا ہے جنہوں نے توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال سے کہیں زیادہ اس فوری برائی کے خلاف محاذ آرائی کی جو اس قوم کی عادت یا فیشن بن چکی تھی۔

حضرت لوطؑ کا اسوہ

قوم لوطؑ وادی فلسطین کے درمیان واقع آج کل کے شرق اردن (Trans Jordan) میں رہتی تھی جو بحیرۂ مُردار کے آس پاس واقع تھا اس علاقہ میں میلوں تک باغ ہی باغ تھا جس کا حسن وجمال اور شادابی وسرسبزی انسان کو سرمست کرنے کے لئے کافی تھی لیکن وہ قابل نفرت فعل جس کی وجہ سے وہ عذاب کی مستحق ٹھہری عورتوں کے بجائے حسین لونڈوں سے خواہش نفس پوری کرنا تھا اور اس پر غضب یہ تھا کہ

یہ فحش کام وہ چوری چھپے نہیں بلکہ علانیہ اپنی مجلسوں میں ایک دوسرے کے سامنے کرتے تھے اور اس طرح شہوت رانی کا یہ غیر فطری فعل ان کے یہاں فیشن بن چکا تھا۔ چنانچہ حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کو سب سے پہلے اس برائی پر متوجہ کیا، اور توحید سے اپنی دعوت کا آغاز کرنے کے بجائے پہلے اس بے حیائی کو موضوع بحث بنایا یہ طریق کار کیوں اختیار کیا گیا، اس کا بہترین جواب مولانا امین احسن اصلاحی نے یہ دیا ہے کہ ایک برائی تو وہ ہوتی ہے جو خواہ کتنی سنگین ہو لیکن وہ انفرادی عوارض میں سے ہے اور انسانوں کے اندر پائی جاتی ہے یا پائی جا سکتی ہے دوسری بُرائی وہ ہے جس کا کھوج پن اس قدر بڑھ چکا ہے کہ کسی انسان کے اندر عادت کی حیثیت سے اور کسی سوسائٹی کے اندر فیشن کی حیثیت سے اس کا پایا جانا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ اس انسان یا اس سوسائٹی کی فطرت بالکل مسخ ہو گئی ہو جہاں اس طرح کے لوگوں سے سابقہ ہو وہاں اصل قابل توجہ چیز وہی برائی ہوتی ہے، دوسری باتیں خواہ کتنی ہی اہمیت رکھنے والی ہوں سب ثانوی درجے میں آجاتی ہیں۔ آپ ایک شخص کے پاس اس کی اصلاح کی غرض سے جائیں اور دیکھیں کہ وہ کھڑا ہوا غلیظ کھا رہا ہے تو آپ اس کو ایمان واسلام کی تلقین کریں گے یا سب سے پہلے اس کی یہ عبرت انگیز حالت آپ کو متوجہ کرے گی؟ حضرت لوطؑ کو اسی صورت حال سے سابقہ پیش آیا۔ ان کی قوم کے اندر شرک وکفر کی برائی بھی موجود تھی اور دوسری تمام برائیاں بھی، جو شرک وکفر کے لوازم میں سے ہیں، موجود تھیں لیکن جن کی فطرت اتنی اندھی ہو گئی ہو کہ مرد مردوں ہی کو شہوت رانی کا محل بنائے ہوئے ہوں ان کو تو سب سے پہلے اس غلاظت کی دلدل سے نکالنے کی ضرورت تھی ان سے کوئی دوسری بات کرنے کا مرحلہ تو بہرحال اس کے بعد ہی آسکتا تھا۔ چنانچہ قرآن حضرت لوطؑ کی دعوت کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے۔

ولوطا إذ قال لقومه أتأتون الفاحشة ما سبقكم بها من أحد من العالمين — اور لوطؑ کو ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا پھر یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا " کیا تم ایسے

إنكم لتأتون الرجال شهوة من دون النساء بل أنتم قوم مسرفون (اعراف: ۸۱)

بے حیا ہو گئے ہو کہ وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا؟ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔

قرآن حضرت لوطؑ کے حوالہ سے یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ معاشرہ میں جو برائی سب سے زیادہ نمایاں ہو اور لوگوں نے اسے متفقہ حیثیت سے قبول کر لیا ہو اس پر ضرب لگانا داعی کی اولین ذمہ داری ہے چاہے اس کی سزا کتنی ہی ہولناک ہو۔ معاشرہ کے معمولات میں خلل ڈالنا اور لوگوں کی عادت یا فیشن پر انگلی اٹھانا کسی طرح گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ قرآن ہی میں یہ بھی بتاتا ہے کہ حضرت لوطؑ کو اپنی دعوت کے جواب میں بستی سے نکال دینے کی دھمکی دی گئی۔

وما كان جواب قومه إلا أن قالوا أخرجوهم من قريتكم إنهم أناس يتطهرون (اعراف: ۸۲)

مگر اس قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ نکالو ان لوگوں کو اپنی بستیوں سے بڑے پاکباز بنتے ہیں یہ۔

حضرت شعیبؑ کا اسوہ

شعیبؑ کی قوم تجارت پیشہ تھی اور اس کی بستیاں حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحر احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے ایسی جگہ آباد تھیں جہاں سے ایک تجارتی شاہراہ یمن سے مکہ اور ینبوع ہوتی ہوئی شام کو جاتی تھی اور دوسری شاہراہ عراق سے مصر کو جاتی تھی ان دونوں شاہراہوں کے عین چوراہے پر یہ لوگ آباد تھے اور ادھر سے گزرنے والے تمام قافلوں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ ناپ تول میں کمی جو ان کی نمایاں خصوصیت تھی، دراصل ان کے اندر بہت سی برائیوں کے جمع ہو جانے

کی علامت تھی ان کے پورے نظام تمدن و معاشرت میں بے ایمانی، بداخلاقی اور بدعنوانی سرایت کئے ہوئے تھی لیکن تجارتی معاملات میں ان کی دھاندلی نے انھیں بدنام کر رکھا تھا چنانچہ حضرت شعیبؑ نے انھیں توحید کی دعوت دینے کے ساتھ ناپ تول میں انصاف کرنے کی تلقین کی۔

"اے برادران قوم اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی صاف رہنمائی آگئی ہے لہذا وزن اور پیمانے پورے کرو، لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو۔ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے، اسی میں تمہاری بھلائی ہے اگر تم واقعی مومن ہو اور ہر راستے پر رہزن بن کر نہ بیٹھ جاؤ کہ لوگوں کو خوف زدہ کرنے اور ایمان لانے والوں کو خدا کے راستے سے روکنے لگو اور سیدھی راہ کو ٹیڑھا کرنے کے درپے ہو جاؤ۔"

(اعراف: ۸۵-۸۶)

لیکن حضرت شعیبؑ کی اس دعوت کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدین کے سرداروں اور لیڈروں نے کہا اور اسی بات کا اپنی قوم کو یقین بھی دلایا کہ شعیبؑ جس ایمانداری اور راست بازی کی دعوت دے رہا ہے اور اخلاق و دیانت کے جن مستقل اصولوں کی پابندی کرانا چاہتا ہے اگر ان کو مان لیا جائے تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ ہماری تجارت کیسے چل سکتی ہے اگر ہم بالکل ہی سچائی کے پابند ہو جائیں اور کھرے کھرے سودے کرنے لگیں اور ہم جو دنیا کی سب سے بڑی تجارتی شاہراہوں پر بستے ہیں اور مصر و عراق کی عظیم الشان متمدن سلطنتوں کی سرحد پر آباد ہیں اگر ہم قافلوں کو چھیڑنا بند کر دیں اور بے ضرر و پرامن لوگ ہی بن کر رہ جائیں تو جو سیاسی اور معاشی فوائد

ایسی ہی موجودہ جغرافی پوزیشن سے حاصل ہو رہے ہیں وہ سب ختم ہو جائیں گے اور آس پاس کی قوموں پر ہماری جو دھونس قائم ہے وہ بھی نہ رہے گی لیکن آخر کار اہل مدین پر ہولناک دھماکہ اور زلزلہ نازل ہوا اور قوم کی یہ تباہی مدت دراز تک آس پاس کی قوموں میں ضرب المثل رہی ہے۔

حضرت شعیبؑ کا اسوہ اس بات پر دلیل ہے کہ توحید کی اصل دعوت دینے کے ساتھ معاشرہ کی خرابیوں اور برائیوں پر انگلی رکھنا بھی ناگزیر ہے بلکہ معاملات میں بددیانتی وہ سنگین جرم ہے جو پورے نظام تمدن کو فاسد بنا دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ پیغمبر نے توحید کے ساتھ ہی ناپ تول میں انصاف کرنے کی دعوت دی اور قوم مدین نے اسی دکھتی رگ کے پکڑنے پر غصہ کا اظہار کیا اور اپنی بستی سے نکال دینے کا ڈراوا دیا (۹)

حضرت موسیٰؑ کا اسوہ

بنی اسرائیل صدیوں سے مصر میں انتہائی ذلت و نکبت اور غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے ان پر مظالم کا ایک دور وہ تھا جو حضرت موسیٰؑ کی پیدائش سے پہلے رعمسیس ثانی کے زمانے میں جاری ہوا تھا اور دوسرا دور ستم وہ تھا جو فرعون منفتاح کے دور میں موسیٰؑ کی بعثت کے بعد شروع ہوا ان دونوں ادوار میں بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کیا جاتا اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جاتا تھا۔ غلامی نے ان کے اندر جو اخلاقی انحطاط اور پست ہمتی پیدا کر دی تھی اور زبردستی محکومیت کی وجہ سے جس مجبورانہ ذہنیت کے وہ حامل بن کر رہ گئے تھے اس کی وجہ سے ان میں اتنا دم بھی نہ رہا تھا کہ اس ظلم و ستم اور غلامی و مجبوری کے خلاف آواز بلند کرتے بلکہ جن نوجوانوں نے پیغمبر کی دعوت حق و آزادی پر لبیک کہا ان کا ساتھ دینے سے بھی انکار کر دیا۔

بنی اسرائیل کا فوری مسئلہ کفر و ضلالت کے ساتھ غلامی و مجبوری بھی تھا کیونکہ غلامی وہ لعنت ہے جس کی موجودگی میں انسان کی قوت فیصلہ اور احتساب چھین جاتی ہے۔ ایک غلام زندگی کے مسائل پر آزادانہ سوچ نہیں سکتا نہ اقتدار و نصب العین کیلئے جدوجہد کر سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ موسیٰؑ نے اس کو فوری اہمیت دی اور حق کی دعوت دینے کے ساتھ بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ بھی کر دیا۔

"تم دونوں اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم تیرے رب کے فرستادے ہیں بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کیلئے چھوڑ دے اور انکو تکلیف نہ دے ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے ہیں اور سلامتی ہے اس کیلئے جو راہ راست کی پیروی بھی کرے ہم کو وحی سے بتایا گیا ہے کہ عذاب ہے اسکے لئے جو جھٹلائے اور منہ موڑے۔"

(طٰہٰ: ۴۷، ۴۸)

حضرت موسیٰ کا پروگرام یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو مصر کے غلامانہ ماحول سے الگ لے جا کر منظم کریں اور ان کے اندر ان تمام دینی روایات کو از سر نو زندہ کریں جو مصر کی محکومانہ زندگی میں بالکل مردہ ہو چکی تھیں اور اس کے لئے آزادی ناگزیر تھی کیونکہ غلامی کی حالت میں ان کی دینی تنظیم و تجدید ناممکن تھی یہی وہ عظیم مقصد ہے جس کی خاطر رسول معروف سنت الٰہی کے مطابق ہجرت کرتا ہے اور اس کے بعد اس کے اور اس کے باایمان ساتھیوں کی نجات و فلاح کی راہ کھلتی ہے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی اس کشمکش میں عام اسرائیلیوں کا طرز عمل بالکل الٹا تھا وہ حق و آزادی کی دعوت کا ساتھ دینے کے بجائے مصلحت پرستی، دنیوی اغراض کی بندگی اور عافیت کوشی میں اس طرح مبتلا رہے کہ الٹے حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کو ان تمام بلاؤں کا موجب قرار دینے لگے اور دعوت موسیٰؑ پر لبیک کہنے والے چند نوخیز عناصر کو یہ کہہ کر روکتے رہے کہ موسیٰؑ کے قریب نہ جاؤ ورنہ تم خود بھی فرعون کے غضب میں مبتلا ہو گے اور ہم پر بھی آفت لاؤ گے۔

"جب وہ فرعون کے پاس سے نکلے آ رہے تھے تو ان کو موسیٰ اور ہارون ملاقات کے لئے رستہ پر کھڑے ملے تب انہوں نے ان سے کہا کہ خداوند ہی دیکھے اور تمہارا انصاف کرے

تم نے ہم کو فرعون اور اس کے خادموں کی نگاہ
میں ایسا گھناؤنا کیا ہے کہ ہمارے قتل کیلئے
ان کے ہاتھ میں تلوار دے رکھی ہے۔"۹

تلمود میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل موسیٰؑ اور ہارونؑ سے کہتے تھے۔

"ہماری مثال تو ایسی ہے جیسے ایک بھیڑیے
نے بکری کو پکڑا اور چرواہے نے اگر اسی کو
بچانے کی کوشش کی اور دونوں کی کشمکش میں
بکری کے ٹکڑے اڑ گئے بس اسی طرح تمہاری
اور فرعون کی کھینچ تان میں ہمارا کام تمام ہو کر
رہے گا۔"۱۰

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ دوسرے انبیاء کی طرح حضرت موسیٰؑ نے بھی بنی اسرائیل کو حق اور اسلام کی دعوت دی۔ ان سب کی دعوت اور مقاصد دعوت میں کوئی فرق نہیں ہے نہ دعوت کے مدارج و مراحل میں کوئی فرق ہے؟ تو یہ سوال بھی برحق ہوگا لیکن قرآن کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ بنی اسرائیل کو فرعون نے غلام بنا رکھا تھا اور غلامی کی موجودہ حالت میں دین کے تقاضے پورے نہیں کئے جا سکتے تھے اسی لئے حضرت موسیٰؑ نے ان کی آزادی کا مطالبہ کیا اور قرآن نے اس مطالبہ کو بار بار دہرایا۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ موسیٰؑ کوئی نیشنلسٹ لیڈر تھے جو محض آزادی کے حصول اور غیروں کی غلامی کا جوا اتار پھینکنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ البتہ یہ امر واقعہ ہے کہ غلامی کی حالت میں اصلاح و انقلاب کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا نہ کسی قوم کی دینی و سیاسی تنظیم جدید ممکن ہے اسی لئے غلام قوم کو دین اسلام کی طرف بلانے کے ساتھ اسے آزاد کرانا بھی ضروری ہے کیونکہ اسلام اور غلامی دو مختلف و متضاد چیزیں ہیں جو چیز ایک کیلئے پیرہن کا کام کرتی ہے وہی چیز دوسرے کیلئے کفن ثابت ہو جاتی ہے

سیرت طیبہ سے رہنمائی

اس سلسلہ میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے کہیں زیادہ واضح رہنمائی ملتی ہے۔ پچھلے انبیاء کے واقعات قرآن میں بیان ہوئے ہیں عبرت و موعظت ہی کے لئے لیکن مکمل اسوہ تو صرف حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے کیونکہ آپ آخری نبی ہیں اور آپ پر دین اسلام کا اتمام ہوا ہے۔ سیرت طیبہ سے بے شمار مثالیں ایسی ملتی ہیں جن سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ ایک داعی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی مخاطب قوم کے مسائل سے بھی دلچسپی لے۔ ظلم و جور کے خاتمہ کیلئے جدوجہد کرے اور دوران دعوت میں بھی عدل و انصاف کے قیام کیلئے کوشش کرے۔ اگر کوئی شخص یا گروہ یہ دلیل دے یا موقف اپنائے کہ اصل کام دعوت الی اللہ ہے اور مخاطب قوم کے مسائل میں دلچسپی لینا اپنی راہ کھوٹی کرنا ہے تو یہ دین کے مزاج کے خلاف ہے اور سیرت رسول کے واقعات اس کے علی الرغم گواہی دیتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیس سال کے تھے جب قریش کے چند قبائل نے ایک معاہدہ کیا جس کو حلف الفضول کہا جاتا ہے۔ اسے لفظ "فضول" سے تعبیر کرنے کی وجہ ابن اثیر نے نہایہ میں یہ بیان کی ہے کہ جرہم کے زمانہ میں بھی ایسا ہی ایک حلف (معاہدہ) ہوا تھا جس کے طے کرنے والے سب آدمیوں کے نام فضل تھے اس لئے اسے حلف الفضول کہا گیا تھا لیکن صحیح وجہ وہ ہے جسے حافظ ابن کثیر نے حمیدی کے حوالے سے حضرت ابوبکرؓ کے دو صاحبزادوں محمد اور عبدالرحمٰن سے نقل کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا "میں عبداللہ بن جدعان کے گھر میں ایک ایسے حلف (معاہدہ) میں شریک ہوا جس میں شرکت کی اگر مجھے اسلام کے زمانے میں بھی دعوت دی جائے تو میں اسے پسند کروں گا۔" پھر اس معاہدہ کی تشریح آپ نے یہ فرمائی۔ تحالفوا أن یردوا الفضول علی أھلھا وأن لا یعد ظالم مظلوماً۔ ترجمہ: انہوں نے اس بات پر

باہم معاہدہ کیا کہ فضول کو اس کے حقداروں کی طرف پہنچائیں گے اور ظالم مظلوم پر زیادتی نہ کرنے پائے گا۔ (فضول کو اس کے حقداروں کی طرف پہنچانے کا مطلب یہ ہے جو فضول کسی ظالم نے زبردستی کسی صاحب حق سے چھینا ہو اسے واپس دلوایا جائے اور ظالم کو اس کے ظلم پر قائم نہ رہنے دیا جائے۔ ابن سعد نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے باہم طے کیا کہ ہم مظلوم کا ساتھ دیں گے اور اس کا حق اسے دلوا کر رہیں گے۔ ابن ہشام نے معاہدہ کی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ مکہ میں شہر کے کسی باشندے یا باہر سے کسی آنے والے پر کوئی ظلم نہ ہونے دیں گے اور ظالم کے مقابلہ میں مظلوم کی مدد کریں گے
ابن سعد نے اس معاہدہ کی تاریخ ذی القعدہ سنہ ۲۰ عام الفیل لکھی ہے۔ (جاری)

۱۔ ابن ہشام: سیرت رسول اللہ، تحقیق و ترتیب الاستاذ محمد محی الدین عبد الحمید (جامع ازہر) جلد اول: ص ۳۱۶۔ ۲۔ نفس مصدر جلد دوم، ص ۲۷۔

۳۔ قرآن، شعراء، ۱۷۶۔ عنکبوت: ۳۶، ہود: ۷۷ تا ۷۹، حجر: ۶۷ تا ۷۲۔

۴۔ قرآن، عنکبوت، ۲۹۔

۵۔ امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن جلد دوم، فاران فاؤنڈیشن، لاہور ۱۹۸۳ء، ص ۴۸۲۔

۶۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تفہیم القرآن جلد دوم، سورہ اعراف، حاشیہ ۷۴۔

۷۔ قرآن، اعراف، ۹۱-۹۲: فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ ۝ الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۚ الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَانُوا هُمُ الْخَاسِرِينَ۔

۸۔ قرآن اعراف، ۸۸۔ ۹۔ کتاب الخروج ۶: ۲۰-۲۱

۱۰۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تفہیم القرآن جلد دوم: سورہ یونس حاشیہ ۹۷۔

۱۱۔ امین احسن اصلاحی، تنقیدات: مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان ۱۹۵۵ء۔ مولانا نے اس کتاب میں ایک مفصل مضمون اسی موضوع پر شامل کیا ہے تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیں ص ۷۰-۷۳۔

۱۲۔ سیرت ابن کثیر جلد اول ص ۲۵۷-۲۵۹۔

منقبت حضرت حسین رضی اللہ عنہ

شفیق طاہری

سلام روحِ علیؓ جانِ مصطفیٰؐ کو سلام — مری طرف سے شہنشاہِ کربلا کو سلام
سلام عقدہ کشائے جہانِ ہستی کو — لہو کے رنگ میں ڈوبی ہوئی صدا کو سلام
سلام وقت کی ادراک و دور شناسی کو — امینِ سرِ نہاں راز آشنا کو سلام
سلام رہبرِ منزل کی بے نیازی کو — ستم گروں میں گرجتی ہوئی صدا کو سلام
سلام صبر و عزیمت کے اس عادی کو — تمام عالمِ امت کے پیشوا کو سلام
سلام وادیٔ غربت کی بے نوائی کو — خموش لب پہ مچلتی ہوئی دعا کو سلام
جوارِ وقتِ بلاخیز بھی مہک اٹھا — ترے نفس کی شمیم آفریں صبا کو سلام
سلام خیر سے لبریز ذاتِ عرفاں کو — سلام اپنی حقیقت سے آشنا کو سلام
تری حیات نمونہ تری اجل معیار — امامِ وقت تری ایک اک ادا کو سلام

شفیق پھر ہے تقاضا جہاں میں عظمت کے ملنے
وہی نظام وہی جبر کی صورت ہے
پھر ایک بار بپا حق کے دامن سے
پھر ایک بار جہاں کو تری ضرورت ہے

غزل

حادثے ہر دو دیدہ پہ جم آئے ہیں — شہر میں جب سے حافظ کے قدم آئے ہیں
غم زدو، اب کے کہو آدابِ نظر مت رکھیں — جاب دل پہ چھپے کچھ اہلِ کرم آئے ہیں
مسند تھا کہ چھپی بت شکنی کی میراث — حادثہ ہے کہ کعبے میں صنم آئے ہیں
اس طرح ہم پہ نگاہیں ہیں خریداروں کی — جیسے پھر مصر کے بازار میں ہم آئے ہیں
حاضرِ انجمنِ ناز ہیں اربابِ نشاط — ہم بھی دامن میں لئے دولتِ غم آئے ہیں
ترنا ہر دور کی تاریخ کا عنواں ہے شفیق — جو اٹھے ہیں انھیں ہاتھوں میں قلم آئے ہیں

مکرمی مدیر صاحب! ماہنامہ "حیات نو" السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عزیزہ فوزیہ خانم جو کلیۃ البنات جامعۃ الفلاح بلریا گنج کی ایک ذہین و فطین طالبہ تھی۔ وہ اپنے علاقے میں صنفِ نازک کے اندر ایک چاند تھی جو سب سے پہلے علم و فضل کے سرچشمے سے فیضیاب ہو کر اپنے ماحول میں جلوہ گستر ہونے والی تھی۔ اس سے مستقبل کی امیدیں وابستہ تھیں مگر اس کی زندگی کا مختصر عرصہ ۔۔۔۔ ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۸۔۶۔۱۹۸۷ء یوم یکشنبہ کو تقریباً بیس سال کی عمر میں پورا ہو گیا۔ وہ اس دنیائے فانی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی اور لوگوں کی امیدیں جوں کی توں دھری رہ گئیں۔ یہ چند تاثراتی الفاظ ماہنامہ "حیات نو" میں اشاعت کے لئے حاضر ہیں۔

فوزیہ فاضلہ فلاحی

شیخ منصف مبارکپوری — استاذ جامعہ

حیا پرور، ترے بچپن کی صورت یاد آتی ہے
ترے انداز میں حسنِ حیا کا فطری جوہر تھا
تری اوجِ جبیں پر رقص زن تھا حسنِ مستقبل
فضیلت میں ترا ممتاز آنا یاد ہے مجھ کو
صفِ درسی میں بالاتر تھی تیری اپنی پوزیشن
ترے صدمے کا عالم ہوگا کیا اے اُمّ فوزیہ
یا اس کے باپ، دادا کے لئے بھی سخت صدمہ ہے
یہ صدمہ بھائیوں، بہنوں کو بھی نم دیدہ کرتا ہے
سراسر اس کی صورت، مظہرِ اخلاق تھی گویا
شگفتہ شکل و صورت، مظہرِ شانِ متانت تھی

شرافت جس سے ظاہر تھی وہ ہیئت یاد آتی ہے
یہ تیری قرآن کی اچھی خدمت یاد آتی ہے
مجھے رہ رہ کے وہ تیری وجاہت یاد آتی ہے
جسے مردن وہ تیری قابلیت یاد آتی ہے
اب وہ ذہن رساؤ قابلیت یاد آتی ہے
مجھے اب بھی تری غمناک حالت یاد آتی ہے
مجھے ان کے ملال و غم کی شدت یاد آتی ہے
انھیں جب اپنی آپا کی محبت یاد آتی ہے
ابھی تک اس کے چہرے کی بشاشت یاد آتی ہے
ابھی، ماں، باپ و طلعت کی متانت یاد آتی ہے

وہ اپنی زندگی میں اک دُرِ تاباں تھی اے منصف
مجھے اب اس دُرِ تاباں کی قیمت یاد آتی ہے

[illegible]

حنا عابدی، دربھنگہ

خواہشِ دیدِ حرم پھر اس بار بھی دستِ افسوس دل میں دبی رہ گئی
کارواں حاجیوں کا رواں دیکھ کر آنکھ میں آنسوؤں کی جھڑی رہ گئی
حاجیو ہو مبارک یہ حج کا سفر، ہو مبارک خدا کا یہ گھر دیکھنا
مجھ کو تو سال بھر اب ہے یہ دیکھنا جذبۂ دل میں کیا کچھ کمی رہ گئی
دا مجھے ارضِ مقدس پہ جب دیکھو! دعا کرنا تم باادب حاجیو!
اس تمنا کی جانب ہو چشمِ کرم، وقت کی دھوپ میں جو جلی رہ گئی
جذبۂ عشقِ طیبہ ہے صادق مرا، نیت دل سے میری ہے وقفِ خدا
اوج پہ کل کو ہوگا نصیبہ مرا بس اسی امید میں زندگی رہ گئی
دل کسی شے پہ آئے تو کیسے بھلا، لطف جینے کا آئے تو کیونکر یہاں
خواہشِ دیدِ کعبہ کی تکمیل پر منحصر جب عطا ہر خوشی رہ گئی

غزل

مسعود جاوید ہاشمی — مدیر "فنکار" حیدرآباد

ضوفشاں حسن جو لب تاب کے انداز بہت
سرکشی پہ بھی کسی روز اتر سکتے ہیں
ابھی تصویر ہی دیکھی ابھی آواز سنی
صبح آرزو پہ موقوف ہے پرواز بلند
دل بھی بے ساختہ سینوں سے نکل آتے ہیں
سامنے آئے گا انجام بھی اچھا جاوید

ہم کو دہ رہ کے دیئے جاتے ہیں آواز بہت
دل ہے کس کا جو اٹھاتے ہیں ترے ناز بہت
ذرے ذرے میں ہیں مدفون ابھی راز بہت
ورنہ انساں کی ہے محدود تگ و تاز بہت
بات ہوتی ہے تمہاری اثر انداز بہت
طرز پہ جیسے خوش آئند ہے آغاز بہت

انسا ← عزیز الدین عزیز ۔ بلگام ۔ کرناٹک

تحریکِ اسلامی کی معتبر آواز ۔ حفیظ میرٹھی

حفیظ الرحمٰن حفیظؔ میرٹھی پر اظہار خیال معتبروں کا کام ہے۔ مجھ جیسے طفل مکتب، حفیظؔ جیسے عظیم المرتبت شاعر پر لکھنے کی جرأت کرنے لگیں تو شاید وہ تبصرے کی دنیا کا ایک المیہ ہی قرار دیا جائے گا۔ لیکن اس حقیقت کا کیا کیا جائے کہ حفیظ صاحب کے ساتھ بڑے بڑے تبصرہ نگاروں نے بڑا ظلم کیا ہے۔ ان کے کلام کو بالعموم نظر انداز کرنے والوں میں تیرے بڑے بڑے نقاد اور مبصر بھی شامل ہیں۔ سوچتا ہوں کہ اپنے محبوب شاعر کی شاعرانہ عظمتوں کے مختلف گوشوں پر سے پردہ اٹھانے کو جیالے انھیں کیوں نہیں آئے۔ حفیظ صاحب نے کہا ہے ؎

میری باتوں پہ ہنستی ہے دنیا ابھی ۔۔۔ میں سنا جاؤں گا فیصلوں کی طرح

لیکن اس سے قبل حفیظؔ کی شخصیت وفن سے دنیا کو روشناس کرانے کا کام ابھی، واجب ہے اور جب دیرینہ نقاد و تبصرہ نگار حضرات ہی انجام دے سکتے ہیں۔ چنانچہ آج حفیظ پر مضامین کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ اس روشنی کی تقلید کے طور پر نہیں کہ ادھر مجموعۂ کلام منظر عام پر آگیا اور ادھر مبالغہ آمیز مضامین کے ڈھیر لگ گئے بلکہ ملتِ اسلامیہ کے اس وفا شعار شاعر کے پیغام کو عام کرنے کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ اس وقت ادبی فضا میں جن مریضانہ رجحانات کی حامل بن گئی ہیں انہیں پاک وصاف کرنے پر مسلّم ادبی روایات کے روشن مستقبل کا دارومدار ہے۔ مجموعی اعتبار سے حفیظؔ جیسے شعراء جو ہمارے ادب پر، جو دراصل ایک لٹی ہوئی دوکان کی طرح ہے، ان بچے کھچے تاروں کی مانند ہیں جنہیں بجا طور پر "متاعِ آخرِ شب" کہا جا سکتا ہے ؎

متاعِ آخرِ شب ہیں بچے کھچے تارے ۔۔۔ بساط جیسے جڑی ہے لٹی دکان کی طرح

ابو عمار صاحب نے لکھا ہے:

"آج کے اس فکری بے راہ روی کے دور میں صحیح فکر کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

آزادیٔ فکر اور آزاد خیالی کے اس پر فتن دور کی اصل اساس پر آج ضرب کاری لگائی جا رہی ہے....

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے اردو کلاسیکی غزل کے پاسدار، محافظ اقدار، نامور معاصر شاعر حفیظ میرٹھی کے کلام کی اشاعت میرے نزدیک ادب واقدار حیات کی ایک اہم خدمت ہے۔"

میں سمجھتا ہوں کہ "متاعِ آخرِ شب" کی اشاعت کا بار اٹھا کر جناب ابو عمار صاحب (مالک مکتبہ حیدرآباد) نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے جس سے ان کے پیغام کو آگے بڑھانے اور پھیلانے کے لئے تبصرہ نگاروں اور نقادوں کو آگے بڑھنا چاہیئے۔

حفیظؔ صاحب کے محاسن شعری پر لب کشائی جیسا کہ میں نے عرض کیا، مجھ جیسے ہیچ مدان کا کام ہرگز نہیں، تاہم اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے کہ میرے ان حقیر خیالات کو یہ شرف حاصل ہو جائے کہ اہلِ قلم کو اس سلسلے میں تحریک مل جائے۔ میں آغاز کار کے طور پر خامہ فرسائی کی جسارت کر رہا ہوں۔

دراصل حفیظؔ صاحب کے اس شعر نے مجھے کچھ چونکا سا دیا اور غالباً یہی شعر اس مضمون کا محرک بھی بن گیا ہے ؎

یہ کیا مقام ہے کہ ہمارے کلام پر ۔۔۔ تنقید کی گئی ، نہ کوئی تبصرہ ہوا

ایک طرف تو یوں لگا کہ حفیظؔ صاحب "تعلی" سے کام لے رہے ہیں کہ گویا ان کا کلام اس بلندی پر پہنچ گیا ہے کہ جہاں نہ تنقید ضروری ہے نہ تبصرہ، لیکن تھوڑے سے غور کے بعد حفیظؔ صاحب کی خودداری کا قائل ہونا پڑا کہ اپنے دل کی بات بلکہ شکایت اس شانِ خودداری سے نقادوں اور تبصرہ نگاروں کے سامنے رکھی کہ اپنے وقار کو دھکا بھی پہنچنے نہیں دیا اور ساتھ ہی نقادوں اور مبصروں کو یہ احساس بھی دلا دیا کہ نقاد اور تبصرہ نگار نے ان کے کلام پر توجہ نہ کر کے کچھ اچھا نہیں کیا ہے۔ حفیظؔ صاحب کو بالآخر یہ بھی کہنا پڑا کہ ؎

تو جوہری ہے تو زیبا نہیں تجھے یہ گریز ۔۔۔ مجھے پرکھ مری شہرت کا انتظار نہ کر

اس سلسلے میں یہ بھی عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حفیظؔ صاحب تبصرہ نگاری کے لئے ایک ضابطۂ اخلاق کی پابندی کا کرنے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔

ایک بھی لفظ گھٹانے کی نہیں گنجائش ۔۔۔ میرے پیغام محبت کا خلاصہ نہ کرو

شہرت کا ہوں نگار سمجھتے ہوئے خود کو | جب جھوٹی خوشامد کوئی فنکار کرے ہے

اور پھر تبصرہ نگاروں کو یوں تنبیہ کرتے ہیں ؎

ذلیل کرتے ہیں خود تبصرہ نگاروں کو | وہ تبصرے جو فقط اشتہار ہوتے ہیں
اے ایسے دیدے فنکار دو لائق حیف ہے وہ | تشہیر کی کاوش کو بھی جو تخلیق میں شامل جوڑے

پھر پوری خود اعتمادی کے ساتھ عرض کرتے ہیں ؎

آسماں اس سے بہت دور ہے عظمت کا حفیظ | آشیاں فن کا جو شہرت کے شجر پر رکھتا

اگر حفیظ صاحب کے ان نظریات سے آشنا کر لیا جائے تو لازمی طور پر مبصروں کے سامنے تبصرہ کے لئے ایک راہ متعین ہو جائے گی۔ یعنی یہ کہ حفیظ صاحب کو ان کی شہرت کا احساس دلائے بغیر، جھوٹی خوشامد سے دامن بچاتے ہوئے، اشتہاریت سے پرہیز کرتے ہوئے پرکھنا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خود تبصرہ نگار ذلیل ہو جائیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حفیظ صاحب تنقید سے خوف کھاتے ہوں بلکہ تنقید کو تو وہ فال نیک سمجھتے ہیں۔ خود ان ہی کا شعر ہے ؎

تنقید سے شاعر کی تقدیر سنورتی ہے | تعریف کے متوالے! تنقید گوارا کر

اب سوال یہ ہے کہ آغاز کہاں سے ہو؟ میرے خیال میں حفیظ صاحب کے فن اور کلام کو تین حیثیتوں سے دیکھنا ہوگا۔ اولاً یہ کہ ان کے فن کا مقام کیا ہے یعنی جناب اختر انصاری صاحب دہلوی کے الفاظ میں "فن کے تقاضوں کی پاسداری اُن کے یہاں کتنی ہوئی ہے"۔ ثانیاً اُن کے کلام میں یادو بیان پر اثر انداز ہونے کی کس قدر صلاحیت موجود ہے یا پھر اختر انصاری صاحب کے الفاظ میں "شاعر نے فکر کی کس سطح پر شاعری کی ہے"۔ ثالثاً جس تحریک سے انھوں نے اپنے آپ کو وابستہ کیا ہے اس کی فکر کو اپنے کلام میں سمونے میں انھوں نے کس قدر کامیابی حاصل کی ہے اور پھر یہ کہ اپنے رفقائے تحریک کے جذبات کی ترجمانی میں، انھیں کتنی کامیابی ملی ہے۔

آیئے ان تینوں نقطہ ہائے نظر سے حفیظ اور ان کے فن کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ جہاں تک فن کے تقاضوں کی پاسداری کا سوال ہے بلا مبالغہ حفیظ صاحب کے بارے میں جناب اختر انصاری صاحب کے ان خیالات سے پوری طرح اتفاق کیا جا سکتا ہے:

"...... زبان کی روانی، روزمرہ کی صفائی، مصرعوں کی برجستگی، بندش کی چستی،

شستگی و رفتگی، بے ساختگی، شیرینی و فصاحت، بے تکلفی، لطافتِ خیال، حسنِ بیان، نزاکتِ تخیل، صداقتِ جذبات، اثر آفرینی، وجد انگیزی، جدتِ طرازی وغیرہ وغیرہ میں نے حفیظ صاحب کے کلام میں ان چیزوں میں سے بعض یا اکثر کی موجودگی کو محسوس کیا۔"

"فن کے تقاضوں کی پاسداری" کے لئے ضروری ہے کہ شاعر، شاعری کی روایات کا احترام کرنے والا ہو۔ اس کے ساتھ وہ ایسے خیالات پیش کرے جو ذہنی اختراع سے زیادہ کسی واقعہ، کسی سانحہ، کسی کیفیت، کسی منظر پر مبنی ہوں اور خیالات اس انداز سے پیش کئے جائیں کہ سننے والے کو کسی قدر حیرت بھی ہو اور وہ ایک نرالا پن محسوس کرے۔ تیسرے یہ کہ ان خیالات کو ادا کرنے کے لئے استعمال ہونے والے الفاظ نہ صرف یہ کہ مناسب ہوں بلکہ مانوس بھی ہوں۔ چوتھی چیز یہ کہ شعر کا مضمون، شعر میں اسی جوش اور ولولے کے ساتھ سمجھا جائے جس جوش اور ولولے کا پتہ خود وہ مضمون دیتا ہے اور آخری اور نہایت ہی اہم بات شبلی کے الفاظ میں:

"سامعین جب شاعر کو سنیں تو ان پر بھی وہی اثر طاری ہو جو صاحب جذبہ کے دل پر طاری ہوا ہے اور انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے۔"

اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو حفیظ صاحب اس مسئلے میں نہایت ہی کامیاب نظر آتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

ابھی سے ہوش اڑے مصلحت پرستوں کے | ابھی میں بزم میں آیا ابھی کہاں بولا
ہے تجھے ملنے کو لیکن جدا جدا ہی رہے | سب یہ جھکے کہ سب اپنا وقار دیکھتے تھے
شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے | دل ٹوٹے آواز نہ آئے
جو چاہتے ہو کہ تاریخ تابناک بنے | ملا دو خاک میں اپنی جوانیاں لوگو!
یوں ہی مت کر لیجئے احسان کے تجھے قبول | جانے کس احسان کے بدلے میں کیا مانگے کوئی
بات منصب سے نہ دولت سے بنی | کیوں کہ ہم صاحبِ کردار نہ تھے
کس بیچ دوڑ ہے اس دور کے انسانوں کی | تیری دیوار سے اونچی میری دیوار بنے
معیارِ زندگی کو اٹھانے کے شوق نے | کردار پستیوں سے بھی نیچے گرا دیا
یہ لغزشیں ہی منجھدھار تجھے سکھا دیں گی | قدم قدم پہ سہاروں کا منہ نہ دیکھا کر

"زبان کی روانی اور روزمرہ کی صفائی" ملاحظہ فرمائیے اور ساتھ ہی بے ساختگی اور بے تکلفی بھی:

گلے ہیں قفل پہ پھولوں میں تو نے ڈالے | ایک ایسا بول دے جھونکوں کے درمیاں بولا
"کہا نہ تھا کہ تو ڈرے گا ہم حفیظ تجھے" | اڑا کے وہ مرے دامن کی دھجیاں بولا

اے وائے مجبوریٔ انساں | کیا سوچے اور کیا ہو جائے

دیر کے پاس یا حرم کے قریب | ہم کہیں تیرا آستاں ہے کہاں

دولت ہے ہم نے ہاتھ ملایا تو ہے مگر | اس دشمنِ قرار سے کیا دوستی کریں

"لطافت و نزاکتِ خیال کے ساتھ اثر آفرینی" ملاحظہ فرمائیے:

حیات پوچھ رہی تھی سکوں کا مفہوم | تڑپ کے دل نے ترے درد کی قسم کھائی
ملے ہیں کچھ اس طرح اُمڈ آئے ہیں آنسو | جیسے کہ یہ رخصت ہے ملاقات نہیں ہے
جس شاخ نے آغوش میں کلیوں کو کھلایا | اس شاخ نے پھولوں کے جنازے بھی اٹھائے
رکھ لیا ہاتھ مرا اپنے دھڑکتے دل پر | میں نے جب عہدِ وفا کے لیے اصرار کیا

اس طرح کے اشعار حفیظ صاحب کے کلام میں بے شمار ملیں گے جن میں تاثیر بھی و فصاحت بھی ملے گی حسنِ بیان اور جدتِ طرازی بھی ملے گی۔

پھر یہ بات کہ دیوان پڑھ کر اندازہ ہو سکے کہ حفیظ کے کلام میں کتنی صلاحیت ہے، میں سمجھتا ہوں کہ جن حضرات نے حفیظ کے کلام کا مطالعہ کیا ہے وہ یقیناً میری اس بات کو مبالغہ آرائی پر محمول نہیں فرمائیں گے کہ حفیظ کا سارا ہی کلام وجدانی کیفیات سے بھرا ہے۔ یہ نہ ہو تو شاعر کو شاعر کیسے کہیں گے اور بات حفیظ صاحب کی ہو تو کیا کہنے۔ جناب سید مسعود حسن رضوی نے ایک جگہ لکھا ہے:

"شاعری حسن کی قوتوں کو چونکاتی ہے، سوتے احساس کو جگاتی ہے، مُردہ جذبات جگاتی ہے، دلوں کو گرماتی ہے، حوصلوں کو بڑھاتی ہے اور گری ہوئی قوموں کو ابھارتی ہے..."

ان خیالات سے اتفاق کرنا ان لوگوں کے لیے زیادہ مشکل نہیں ہوگا جنہوں نے خود حفیظ صاحب کو یہ اشعار پڑھتے ہوئے سنا ہے ؎

چھین کر غیرت اپنوں نے مجھے قتل کیا | آپ ہی ڈھال بنے آپ ہی تلوار بنے
کچھ تو ہو گی رکھ رکھاؤ کی آخر انتہا | زخم اگر حد سے زیادہ ہو تو چہرہ کیا کرے

کم ظرف حسینوں کا ستایا ہوا ہوں میں | مجھ پر نہ کیجیے کوئی احسان زندگی
ہم بھی تو انساں ہیں آخر ہم سے یہ نفرت کیسی | سب سے لپٹ کر ملنے والو ہم سے کیوں کتراتے ہو

آخر میں یہ نقطۂ نظر کہ حفیظ میرٹھی نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی برپا کردہ تحریک جس سے اب وہ باضابطہ طور پر وابستہ ہیں، کی فکر کو اپنے کلام میں سمونے میں انھوں نے کتنی کامیابی حاصل کی ہے اور اپنے رفقائے کار کے جذبات کی ترجمانی میں انھوں نے کتنی کامیابی حاصل کی ہے تو اس سلسلے میں یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ان کی تمام تر شعری صلاحیتوں کا محور دراصل تحریکِ اسلامی کی آفاقی فکر ہی سے منسوب ہے جو تحریکِ اسلامی کے لٹریچر میں موجود ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قدم قدم پر وہ تحریکِ اسلامی کے نظریات کو پیش کرتے اور رفقائے تحریکِ اسلامی کے جذبات و احساسات کی بھرپور ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ تحریکِ اسلامی اس وقت جس دور سے گزر رہی ہے اور رفقائے تحریک جن تجربات سے گزر رہے ہیں ان کا پرتو صاف طور پر حفیظ کے کلام میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ جتنا عمل کا اور جتنے جوش و ولولے کے ساتھ حفیظ صاحب کو جماعت اسلامی کے حلقے میں داد و تحسین سے نوازا جاتا ہے اس قدر داد و تحسین اور ولولے کے ساتھ غیر جماعتی حلقوں میں داد نہیں ملتی۔ وہ ایک فطری بات بھی ہے۔ جس طرح داغ دہلوی کے اس شعر کی اسلامی حلقوں میں کوئی پذیرائی فطری طور پر نہیں ہوگی کہ ؎

دنیا سے خفا تو بھی ہے ناراض ہوں میں بھی | میں بال بڑھا لیتا ہوں تو داڑھی بڑھا لے

یا ساحر لدھیانوی کے اس شعر کو اسلامی معاشرہ پورے حقارت سے ٹھکرا دینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرے گا کہ ؎

عقائد وہم ہیں مذہب خیالِ خام ہے ساقی | ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی

بالکل اسی طرح حفیظ کی یا حفیظ جیسے دوسرے اسلامی فکر کے شعراء کے اشعار کو اس توجہ اور انہماک کے ساتھ غیر جماعتی حلقوں میں نہیں سنا جائے گا۔ چنانچہ عصرِ حاضر میں ادب کا شاعر ہونا اہمیت کی بات نہیں ہے بلکہ کسی تحریک کا کامیاب شاعر ہونا اہم بات ہے جس کے برخلاف پروفیسر عبدالمغنی صاحب نے یوں فرمایا ہے:

"میرے نزدیک حفیظ میرٹھی کی شاعری کی اہمیت یہ ہے کہ وہ محض کسی ورقۂ ادب کے شاعر نہیں ہیں بلکہ ادب کے شاعر ہیں۔"

درِاصل حفیظ کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے انقلابات کے اس دور میں جس تحریک کے ساتھ وابستگی اختیار کرلی، انھوں نے اس کی فکر کی ترجمانی کو اپنا شیوۂ فن بنا لیا اور وقت نے تحریک کو توحید بخشی اور انھیں خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال کرنے میں جو رول ادا کیا ہے اسے تحریکِ اسلامی کی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا۔ اسی لئے میرے خیال میں حفیظ صاحب ادب کے شاعر کم اور ایک مخصوص تحریک کے شاعر زیادہ ہیں اور یہ ان کا قصور نہیں ہے، نہ کوئی عیب۔ مثال کے طور پر ان کے اس شعر کو ؎

اب اہلِ کارواں پہ لگاتا ہے تہمتیں
وہ ہمسفر جو چلتے بہانے میں رہ گیا

تحریک کے نقاد جس پس منظر میں سنتے ہیں وہ یہ ہے کہ تحریکِ اسلامی کے بڑے بڑے لیڈران جو مولانا کے دستِ راست سمجھے جاتے تھے، مختلف حیلوں بہانوں کی بنیاد پر تحریک سے الگ ہوگئے تو خاموشی اختیار نہیں کی بلکہ مختلف قسم کی مخالفتوں سے تحریک اور بانیٔ تحریک کو نوازا۔ نام گنانے کی ضرورت نہیں۔ وہ لیڈرانِ گرامی کون تھے، جماعتِ اسلامی کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے افراد اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ شعر بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے ؎

ہر انقلاب کی تاریخ یہ بتاتی ہے
وہ منزلوں پہ نہ پہنچا جو کارواں سے بڑا

پھر ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے۔ تحریکِ اسلامی کو حکومتِ وقت نے جن عتابوں سے نوازا ہے اس کی جھلک ان اشعار میں صاف نظر آتی ہے ؎

کہا نہ تھا کہ نوازیں گے ہم حفیظ تجھے
اُڑا کے وہ مرے دامن کی دھجیاں بولا

قہر آلود تھے ماحول کے تیور کتنے
مر کے پھر بھی محبت نے کئے سر کتنے

معاف لے تو گرفتار وہ مرے پر تو چپ رہو
مجھے مجبور کرتے تھے قفس کا در سجانے پر

اے صاحبِ عروج تو بامِ عروج سے
سورج کے ڈوبنے کا نظارہ نہ دیکھیو

ہم ابھی جرم بھی سمجھ نہ سکے
فیصلہ بھی سنا گئی دنیا

حفیظ صاحب کی مشہور غزل "زنجیریں" تو ایمرجنسی کے زمانہ کی یاد تازہ کرتی ہے جب تحریکِ اسلامی بڑے آزمائش کے دور سے گزر رہی تھی ؎

زنجیر کیا تو ہٹ جائیگی، ہاں رکنے نہ پاؤ دیوانے
میرا کیا ہے ظالم تجھکو بدنام کرینگی زنجیریں

اک جابر کا مجبوروں نے ایسے استقبال کیا
آگیا ہو کوئی مسیحا جیسے درد کے ماروں میں

اسی شعر کی بدولت حفیظ نے بھی جیل کی ہوا کھائی۔ اس کے باوجود بھی انھوں نے اپنے مسلک کی پیروی اس طرح کی ؎

ہر ظالم سے ٹکر لی ہے سچے فنکاروں نے حفیظ
ہم وہ نہیں جو ڈر کر کہہ دیں ہم ہیں تابعداروں میں

یہ عدو اپنی کھنچی ہے تو ہو
وقت کے فرعون سے ڈر جائیں کیا

تحریکِ اسلامی نے اپنے رفقاء کا جو مزاج بنایا ہے اس کی بھرپور ترجمانی حفیظ کے یہاں ملے گی۔ مثال کے طور پر ایوانِ حکومت میں رسائی کی کوشش سے پرہیز اور اہلِ دولت سے گریز ؎

زرپرستوں کا تو اک کھیل ہے کردار کشی
واسطہ ان سے ذرا سوچ سمجھ کر رکھنا

حفیظ میری منشی کو کوئی بھی نہ کرے جادہ
نہ ایوانوں سے وابستہ، نہ درباروں سے وابستہ

ناز برداری نہ کیجے اہلِ دولت کی حفیظ
رفتہ رفتہ حاشیہ بردار ہو جائیں گے آپ

اس لئے گر گئے نظروں سے تری
ہم ترے حاشیہ بردار نہ تھے

رہتا ہے حفیظ اہلِ تکبر سے گریزاں
اس شاعرِ مغرور کو منہ کون لگائے

تم بھی دربار میں حاضری دو حفیظ
پھر رہے ہو کہاں مفلسوں کی طرح

درباری ماحول میں جینا مشکل ہے پہلوؤں کا
یا تو دم گھٹ جاتا ہے یا تلخ نوائی ہوتی ہے

بسا اوقات حاکمِ وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے مظالم کو للکارا ؎

حاکمِ وقت پہ جس وقت میں تنقید کروں
ہاتھ اس وقت زیادہ مرے منہ پر رکھنا

تو زن تھکوا دیں اگر مرنے کی جی میں ٹھان لیں
جتنا تم سمجھے ہوئے ہو اتنے ہم بودے نہیں

کہہ دیا دنیا سے ہم نے "ہم تو حق کے ساتھ ہیں"
دیکھنا ہے اب ہمارے ساتھ دنیا کیا کرے

حفیظ کو بھی ہے تائیدِ ظلم کی تاکید
یہ لوگ شمع سے کہتے ہیں تو اندھیرا کر

میں نے اقبالِ جرم کر تو لیا
دیر اب کیا ہے حکمراں لوگو!

ہمیں روکے گی کیا دیوارِ تہمت
محرک ہے خلوصِ دل ہمارا

ضروری ہے کفن بردوش رہنا
وطن ہے کوچۂ قاتل ہمارا

دب کے رہنا ہمیں نہیں منظور
قاتلو! جاؤ اپنا کام کرو!

پھر تحریکِ اسلامی کے ساتھ نام نہاد دیندار طبقے نے جو طرزِ عمل روا رکھا اس کی بھرپور ترجمانی حفیظؔ کے اشعار میں جا بجا ملے گی۔ ؎

سر بکف ہم تو بڑھے دین کی نصرت کیلئے
کفر کا فتویٰ لگا شیخِ حرم کے ہاتھوں

کیسے اللہ والے ہیں یہ اے خدا!
گفتگو، مشورے سازشوں کی طرح

ہمارا راستہ جس نے بھی روکا
اسے شاباشیاں دیں رہبر نے

شیخ قاتل کو مسیحا کہہ گئے
محتسب کی بات کو جھٹلا نہیں کیا

اسکی ہاں میں ہاں نہ ملائی جس پہ یہ جرم ہوا ہے
واعظ نے شامل کر ڈالا ہم کو بھی مجرموں میں

پھر خود تحریک کے اندر موجود ناپسندیدہ عناصر کی مختلف پیرایوں میں نشاندہی بھی فرمائی: ؎

کبھی تعلق کا کبھی فاصلوں کا روز ہے
سفر کا حوصلہ مجھ کو نہ ہمسفر سے ملا

ہو گئے لوگ اپاہج بھی کیسے کیسے
ابھی چلے ہیں ذرا راہ تو بھٹک رہے

نہ میں نے سوز ہی پایا نہ استقامت ہی
حجر حجر کو شکوہ، شجر شجر سے ملا

تحریکِ اسلامی کے لٹریچر میں جو آفاقیت پائی جاتی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ دراصل اس آفاقیت کی بنیاد میں جو فلسفہ کام کر رہا ہے وہ بس یہی ہے کہ ساری انسانیت کے ساتھ خیر خواہی کا رویہ اختیار کیا جائے اور خلوص کا ایسا مظاہرہ کیا جائے کہ دشمن بھی قائل ہو جائیں۔ منافق، بدنیت قسم کے لوگ بھی اس کردار سے متاثر ہونے کے بجائے سخت مقام سے پیش کریں۔ اس کی غمازی کرنے والے چند شعر پیشِ خدمت ہیں ؎

اثر ہوا تو یہ تقریر کا کمال نہیں
مرا خلوص مخاطب تھا۔ میں کہاں بولا

سب مجھ پہ بے سبب جرم لگاتے چلے گئے
میں سب کو اپنے زخم دکھانے میں رہ گیا

میں دوسروں کے لئے بے قرار پھرتا ہوں
عجیب درد مجھے میرے چارہ گر سے ملا

میں اپنے دور کی روداد بربریت بھی
سنا رہا ہوں محبت کی داستاں کی طرح

ہمارا جذبۂ تعمیر دیکھ لے دنیا
سنوار دیتے ہیں قفس کو بھی آشیاں کی طرح

دلِ تباہ مری بات کا خیال نہ کر
ملامتیں بھی تو ہمدرد ہی سے ملتی ہیں

تو اس سے بدگماں نہ ہو یہ ترا حفیظؔ
کتنا ہی بے نیاز سہی بے وفا نہیں

ہر سانحہ ہوا ملتا ہے پہلے مجھ سے
شخصیت میں کشش آئی ہے غم کیا کھو کر

ہم ہیں رندوں کے بھی غم خوار حفیظؔ
یہ الگ بات کہ مے خوار نہ تھے

ابھی تو ہوش اڑے مصلحت پرستوں کے
ابھی میں بزم میں آیا ابھی کہاں بولا

میں کیوں اہلِ جہاں کی ترش روئی کا برا مانوں
گراں خوابی میں جھنجلایا ہی کرتے ہیں جگانے پر

پھر آپ نے اپنے کلام میں نوجوانوں کو عموماً اور تحریک کے رفقاء کو خصوصاً جو پیغام دیا ہے اس کی ایک جھلک ان اشعار میں ملے گی۔ دراصل یہی اشعار ہیں جو تحریک کے متوسلین کو یہ محسوس کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ حفیظؔ ہمارے شاعر ہیں، تحریکِ اسلامی کے شاعر ہیں، اردو ادبِ اسلامی کے شاعر ہیں پھر اس کے بعد اردو ادب کے شاعر ہیں ؎

حق ہوئے ہیں نئے شبنم مزاجی سے مگر
گتھیاں ایسی بھی ہیں جن کو سلجھاتی ہے آگ

ڈرانے چلا خانقاہوں کی طرف شیخِ حرم مجھ کو
مجاہد کا تو مستقبل ہے میدانوں سے وابستہ

ہٹے بیٹھے ہو کیوں بزدلوں کی طرح
آؤ میدان میں غازیوں کی طرح

میری باتوں پہ ہنستی ہے دنیا ابھی
میں سنا جاؤں گا فیصلوں کی طرح

گھر ہوا ہے تنگ اندھیرے کا جب حفیظؔ
امکانِ روشنی کے بھی روشن بہت ملے

کوئی مرحلہ ہو کوئی معرکہ ہو
نظر عارفانہ قدم غازیانہ

آپ چھٹ جائیں گے ہوس والے
تم ذرا بے رخی کو عام کرو

بربادیوں سے لینا ہے کچھ کام اے حفیظؔ
ڈھالا مرثیے کو ہم نے ترانہ بنا لیا

تب جمیں گے قدم جزیرے میں
جب جلا دو گے کشتیاں لوگو!

شان و شوکت کے لئے تو ہے پریشاں حفیظؔ
اور میری یہ تمنا ترا کردار بنے

حفیظؔ کے یہاں ملی جذبات کا عکس بھی نظر آئے گا ؎

داد دیجئے کہ ہم جی رہے ہیں وہاں
ہیں محافظ جہاں قاتلوں کی طرح

ہمسایوں سے ہموطنوں سے لاشیں پہنچا دی ہیں
پیار کی باتیں کرنے والو! قاتل کیوں بن جاتے ہو

میں نے حفیظؔ کے زیادہ سے زیادہ اشعار نقل کرنے کی کوشش اس لئے کی ہے کہ یہی قرینِ انصاف بھی ہے۔ اس سے قارئین کو کسی معتدل فیصلے کے سلسلے میں رائے قائم کرنے میں آسانی ہوگی۔

تحریر: ڈاکٹر عبدالرحمان رافت پاشا
ترجمانی: ابوجاوید

حضرت ثمامہ ابن اُثال رضی اللہ عنہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶ ہجری میں دعوت اسلامی کے دائرے کو وسیع کرنے کا ارادہ فرمایا اس کے لئے آپ نے عرب و عجم کے حکمرانوں کو آٹھ دعوتی خطوط لکھے۔ آپ نے جن حکمرانوں کے پاس یہ خطوط ارسال فرمائے تھے۔ ان میں سے ایک ثمامہ ابن اثال حنفی بھی تھا۔ ثمامہ کو اہم حکمرانوں میں شامل کرنا اور اس کے یہاں دعوتی خطوط روانہ کرنا حیرت انگیز اور قابل تعجب اس لئے نہیں تھا کہ وہ نہایت بااثر اور اہم شخصیت کا مالک تھا۔ وہ دور جاہلیت میں عرب کا ایک حکمران، بنو حنیفہ کا ایک سربرآوردہ رئیس اور علاقہ یمامہ کے ان بادشاہوں میں سے تھا جن کی کوئی بات ٹھکرائی نہیں جاتی۔

جب ثمامہ کے پاس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہونچا تو اس نے اس کے ساتھ نہایت توہین آمیز اور غیر ذمہ دارانہ رویہ اپنایا۔ جھوٹے پندار اور جاہلانہ غرور نے اسکو گناہ پر جما دیا اور اس نے دعوت حق سے اپنے کان بند کر لئے۔ پھر شیطان اس پر سوار ہو گیا اور برابر اسے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر کے ان کی دعوت کو نیست و نابود کر دینے پر انگیختہ کرتا رہا۔ وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بے خبری کی حالت میں اچانک حملہ کر کے آپؐ کا کام تمام کر دینا چاہتا تھا اور اپنے اس ناپاک منصوبے کو تکمیل کے لئے وہ کسی مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا اور اگر اس کے ایک چچا بروقت اس کو اس منصوبے پر عمل کرنے سے روک نہ دیا ہوتا تو اسکا یہ گھناؤنا جرم پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہوتا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس کے شر سے محفوظ رکھا۔ ثمامہ اگرچہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادۂ قتل سے باز آ گیا، لیکن وہ آپؐ کے صحابہؓ کو قتل کرنے کے ارادے سے دست بردار نہیں ہوا، وہ برابر ان کی تاک میں لگا رہا۔ آخر کار وہ چند صحابہ پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا، اور ان کو نہایت دردناک طریقے سے قتل کر ڈالا۔ اس

وجہ سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ میں اس بات کا اعلان فرما دیا کہ وہ جہاں کہیں ملے، قتل کر دیا جائے۔ صحابہؓ کے قتل اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان کے کچھ ہی دنوں بعد ثمامہ نے عمرہ ادا کرنے کا ارادہ کیا۔ اور اس ارادے سے وہ اپنے علاقہ یمامہ سے مکہ کی سمت روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر وہ کعبہ کا طواف اور اس میں رکھے ہوئے بتوں کے لئے قربانی کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن اپنے اس سفر کے دوران وہ مدینہ کے قریب ایک راستے سے گذرتے ہوئے اچانک ایک ایسی آفت میں پھنس گیا جس کا اسے وہم و گمان تک نہیں تھا۔ ہوا یہ کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے کچھ مسلمانوں پر مشتمل ایک فوجی دستے نے جو اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں کوئی شرپسند رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر اس کے باشندوں کو نقصان نہ پہنچا دے۔ ثمامہ کو دیکھا اور اسے گرفتار کر لیا۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی اس کو پہچانتا نہ تھا اور اس کو مدینہ لائے۔ اسے مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا اور اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بہ نفس نفیس اس قیدی کے حالات سے واقفیت حاصل کر کے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر فرمائیں گے۔ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم گھر سے مسجد کی طرف آئے اور اس میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو آپ کی نظر ثمامہ پر پڑی جو ستون سے بندھا ہوا تھا۔ آپؐ نے صحابۂ کرام سے دریافت فرمایا۔

"جانتے ہو تم لوگوں نے کس کو گرفتار کیا ہے؟"

"نہیں اللہ کے رسولؐ! ہم اس سے واقف نہیں ہیں۔" صحابہ نے عرض کیا۔

"یہ قبیلہ بنی حنیفہ کا سردار ثمامہ ابن اثال ہے، اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا" آپؐ نے قیدی کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا۔ پھر آپؐ واپس گھر تشریف لے گئے اور گھر والوں سے کہا کہ "تمہارے پاس جو بھی کھانا ہو، اسے جمع کر کے ثمامہ ابن اثال کے پاس بھیج دو۔" پھر آپؐ نے ہدایت فرمائی کہ "میری اونٹنی کا دودھ صبح و شام دوہ کر اس کو پیش کیا جائے۔" یہ ساری باتیں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ثمامہ سے ملاقات اور اس سے گفتگو کرنے سے پہلے کی ہیں۔

پھر آپ ثمامہ کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے خیال سے اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس سے پوچھا کہ

"ثمامہ! تمہارا کیا خیال ہے، تم ہماری طرف سے کس قسم کے سلوک کی توقع رکھتے ہو؟"

"میں آپ کے متعلق اچھا گمان اور آپ سے اچھے برتاؤ کی امید رکھتا ہوں۔ لیکن اگر آپ میرے قتل کا فیصلہ کرتے ہیں تو ایک ایسے شخص کو قتل کرائیں گے جو قتل کا مجرم ہے اور اگر احسان کر کے مجھے چھوڑ دیں تو ایک احسان شناس کو اپنا ممنون کرم پائیں گے، اور اگر آپ کو مال کی خواہش ہے تو وہ بھی فرمایئے جتنا مال چاہیں گے، دیا جائے گا۔" اس نے جواب دیا۔

اس گفتگو کے بعد رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے ثمامہ کو اس کے حال پر چھوڑا اور دو روز تک اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اس دوران اس کے پاس حسب معمول کھانے پینے کی چیزیں اور اونٹنی کا دودھ برابر پہنچتا رہا۔ دو دن بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پھر اس کے پاس تشریف لائے اور وہی سوال کیا۔

"ثمامہ! تمہارا کیا خیال ہے، تم ہم سے کس قسم کے سلوک کی توقع رکھتے ہو؟"

اس نے جواب دیا۔

"میرے پاس کہنے کی وہی باتیں ہیں جو اس سے پہلے میں کہہ چکا ہوں۔ اگر آپ میرے اوپر احسان کرتے ہیں تو ایک ایسے شخص پر احسان کریں گے جو اس کی قدر پہچانتا ہے اور اگر میرے قتل کا فیصلہ کرتے ہیں تو آپ کا یہ فیصلہ حق بجانب ہوگا کیونکہ میں آپ کے آدمیوں کو قتل کر کے اس کا مستحق قرار پا چکا ہوں اور اگر آپ کو مال کی خواہش ہے تو بتایئے جو چاہیں گے آپ کو پیش کیا جائے گا۔"

اس موقع پر بھی آپ نے اس سے مزید کچھ نہیں کہا بلکہ اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اپنے اگلے روز آپ پھر اس کے پاس گئے اور پھر وہی سوال دہرایا۔

"ثمامہ! تم کو ہماری طرف سے کس برتاؤ کی امید ہے؟"

اور اس نے بھی حسب سابق وہی جواب دیا۔

"اگر آپ میرے اوپر احسان کرتے ہیں تو ایک احسان شناس شخص پر احسان کریں گے اور اگر مجھے قتل کرا دیتے ہیں تو میں اس کا مستحق ہوں اور اگر آپ کو مال کی ضرورت ہو تو فرمایئے آپ کا مطلوبہ مال میں آپ کو پیش کر دوں گا۔"

اس سوال و جواب کے بعد رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو طلب کرتے ہوئے فرمایا:

"ثمامہ کو رہا کر دو۔" اور حسب ارشاد اس کی زنجیریں کھول دی گئیں۔ رہائی پا کر ثمامہ مسجد سے نکلا اور مدینہ کے باہر بقیع کے قریب واقع کھجوروں کے ایک باغ میں گیا جس میں کنواں تھا۔ اپنی سواری کو اس کنوئیں کے پاس بٹھا کر اس کے پانی سے خوب اچھی طرح غسل کیا اور پاک صاف ہو کر پھر اسی راستے سے چل کر مسجد میں واپس آ گیا۔ اس نے مسجد میں مسلمانوں کی ایک مجلس کے قریب پہنچ کر بہ آواز بلند کلمۂ شہادت پڑھ کر اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ پھر رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"اے محمدؐ! خدا کی قسم روئے زمین پر کوئی چہرہ میرے نزدیک آپ کے چہرے سے زیادہ مبغوض اور قابل نفرت نہ تھا مگر اب یہ مجھے ہر چہرے سے زیادہ محبوب ہے، اور خدا کی قسم آپ کے دین سے زیادہ قابل نفرت میرے نزدیک کوئی دین نہ تھا لیکن اب یہ مجھے تمام ادیان سے زیادہ پسندیدہ ہے، اور خدا کی قسم آپ کے شہر سے زیادہ ناپسندیدہ میرے نزدیک کوئی دوسرا شہر نہیں تھا مگر اب آپ کا یہ شہر مجھے تمام شہروں سے زیادہ پسند ہے۔"

تھوڑی دیر رک کر پھر بولے۔

"میں نے آپ کے کچھ ساتھیوں کو قتل کیا ہے۔ اس کی تلافی کے لئے آپ میرے اوپر کیا عائد کرتے ہیں؟" رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ثمامہ! اس سلسلے میں تمہارے اوپر نہ قصاص ہے نہ دیت۔ کیونکہ اسلام نے تمہاری تمام سابقہ زیادتیوں اور غلط کاریوں کو حرف غلط کی طرح محو کر دیا ہے۔" پھر آپ نے اسلام لانے کی وجہ سے جنت کی خوشخبری دی۔ ان کا چہرہ فرط مسرت سے چمک اٹھا کہنے لگے، "خدا کی قسم میں نے آپ کے جتنے صحابہ کو قتل کیا ہے اس سے کئی گنی تعداد میں مشرکین کو قتل کروں گا۔ اور اپنی ذات کو، اپنی تلوار کو اور ان تمام لوگوں کو جو میرے ماتحت اور ہم نوا ہیں، آپ کی اور آپ کے دین کی نصرت و تائید کے لئے وقف کرتا ہوں۔"

تھوڑے توقف کے بعد پھر کہا، "اے اللہ کے رسولؐ آپ کے سواروں نے مجھے اس وقت گرفتار کیا تھا جب میں عمرہ کی نیت سے نکلا تھا تو آپ کے خیال میں اب مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا چاہئے؟" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "تم مکہ جا کر عمرہ ادا کرلو۔ مگر یہ عمرہ اب تم اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کے مطابق ادا کرو گے۔" پھر آپ نے مناسک حج اور

انجام عمرہ کی تعلیم دی۔

حضرت ثمامہ ابن اثال عمرہ کی ادائیگی کے لئے روانہ ہوئے جب بطنِ مکہ میں پہنچے تو وہیں کھڑے ہو کر بلند آواز سے تلبیہ پڑھنا شروع کر دیا۔

لبیک اللّٰھم لبیک، لاشریک لک	میں حاضر ہوں، خدایا میں حاضر ہوں تیرا کوئی
لبیک، ان الحمد والنعمۃ لک	شریک نہیں، میں حاضر ہوں، بیشک ساری
والملک، لاشریک لک۔	تعریفیں اور تمام نعمتیں تیرے لئے ہیں،

اور اقتدار تیرا ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔

وہ دنیا کے سب سے پہلے مسلمان تھے جو تلبیہ پڑھتے ہوئے مکہ میں داخل ہوئے تھے۔ قریش کے لوگ اس ناگہانی اور غیر متوقع آواز کو سن کر سہم گئے اور غضبناک ہو کر دوڑے، انھوں نے اپنی تلواریں بے نیام کر لیں اور آواز کی طرف لپکے تاکہ اس شخص پر ٹوٹ پڑیں جو ان کے کچھار میں گھس آیا تھا۔ وہ لوگ ثمامہ کی طرف بڑھے تو انھوں نے تلبیہ کی آواز اور تیز کر دی۔ وہ ان کی طرف بڑی لاپروائی اور بے خوفی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ ایک قریشی جوان نے تیر چلا کر ان کو قتل کرنا چاہا مگر دوسروں نے اس کو یہ کہتے ہوئے ایسا کرنے سے روک دیا کہ "تیرا برا ہو، جانتا ہے یہ کون ہے؟ یہ یمامہ کا بادشاہ ثمامہ ابن اثال ہے، اگر تم نے اس کو کوئی نقصان پہنچایا تو اس کے قبیلے والے ہمارے یہاں غلے کی برآمد روک کر ہم کو بھوکوں مار دیں گے۔" پھر وہ لوگ اپنی تلواریں میان میں کر کے حضرت ثمامہؓ کے سامنے آئے اور ان سے بولے۔

"ثمامہ! یہ تم کو کیا ہوگیا ہے کیا تم بے دین ہو گئے ہو، اور تم نے اپنا اور اپنے آباء و اجداد کا دین ترک کر دیا ہے؟"

"نہیں میں بے دین نہیں ہوا ہوں بلکہ میں نے سب سے اچھے دین، محمدؐ کے دین کی پیروی اختیار کر لی ہے۔" حضرت ثمامہؓ نے جواب دیا اس کے بعد انھوں نے کہا کہ "اس گھر والے کی قسم، میرے واپس جانے کے بعد یمامہ کے گیہوں کا ایک دانہ اور وہاں کی پیداوار کا کوئی حصہ اس وقت تک تمہارے یہاں نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ تم سب کے سب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع نہ اختیار کر لو۔"

حضرت ثمامہؓ نے قریش کی آنکھوں کے سامنے رسول اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عمرہ کے ارکان ادا کئے۔ انھوں نے غیر اللہ اور بتوں کے لئے نہیں، خدائے تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے قربانی کے جانور ذبح کئے اور واپس اپنے وطن لوٹ آئے۔ واپس آ کر انھوں نے اپنے قبیلہ والوں کو قریش کے یہاں غلے کی سپلائی روک دینے کا حکم دیا۔ قبیلہ والوں نے ان کے اس حکم کی تعمیل کی اور اہل مکہ کے یہاں اپنی پیداوار کی سپلائی بند کر دی۔

اقتصادی پابندی جو ثمامہ بن اثال نے قریش کے خلاف لگائی تھی، بتدریج سخت سے سخت تر ہوتی چلی گئی، اس کے نتیجے میں غلے کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ لوگوں میں فاقہ کشی عام ہو گئی اور ان کی تکلیف اور پریشانی زیادہ بڑھ گئی۔ اور جب نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ ان کو اپنے اور بال بچوں کے بھوک سے مر جانے کا شدید خطرہ لاحق ہو گیا تو انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو لکھا۔

"ہم آپ کے متعلق پہلے سے یہ بات جانتے ہیں کہ آپ صلہ رحمی کرتے اور دوسروں کو اس کی تاکید کرتے ہیں، مگر اس وقت ہم جس صورتِ حال کا سامنا کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ نے ہمارے ساتھ قطع رحمی کا طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے۔ آپ نے باپوں کو تلوار سے قتل کیا اور بیٹوں کو بھوکوں مار رہے ہیں۔ ثمامہ ابن اثال نے غلے کی برآمد پر پابندی لگا کر ہمیں سخت تکلیف اور پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے، اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس کو لکھ دیں کہ وہ غلہ وغیرہ ہماری ضرورت کی چیزوں پر عائد کردہ پابندی ختم کر دیں۔"

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثمامہ کو لکھ دیا کہ وہ قریش کے خلاف پیداوار کی برآمد پر لگائی ہوئی بندش ختم کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے آپ کے حکم کے مطابق وہ پابندی اٹھائی، اور قریش کے یہاں غلے کی سپلائی جاری کر دی۔

حضرت ثمامہ ابن اثال رضی اللہ عنہ زندگی بھر اپنے دین کے وفادار اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کئے ہوئے عہد کے پابند رہے جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی اور اہل عرب اجتماعی اور انفرادی طور پر اللہ کے دین سے نکلنے لگے مسیلمہ کذاب بنو حنیفہ میں نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر کے انھیں اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت دینے لگا، شروع

کو حضرت ثمامہ اس کے سامنے ڈٹ گئے۔ انھوں نے اپنی قوم کو سمجھایا کہ "بنو حنیفہ کے لوگو! خبردار اس گمراہ کی دعوت کو ہرگز قبول نہ کرنا جس میں نورِ ہدایت کا دور دور تک پتہ نہیں ہے خدا کی قسم یہ شقاوت و بدبختی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ہم میں سے ان لوگوں پر مسلط کی ہے جو اختیار کریں اور زبردست امتحان و آزمائش ہے ان لوگوں کیلئے جو اس سے اجتناب کریں۔"

انھوں نے مزید فرمایا۔

"بنو حنیفہ والو! ایک وقت میں دو نبی نہیں ہو سکتے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں، انکے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ نہ ان کی نبوت میں کسی کو شریک کیا گیا ہے۔"

حٰمٓ۔ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ذِی الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَیْهِ الْمَصِیْرُ۝

ح م۔ اس کتاب کا نزول اللہ کیطرف سے ہے جو زبردست ہے، سب کچھ جاننے والا گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے، سخت عذاب دینے والا اور بڑا صاحب فضل ہے، کوئی معبود اس کے سوا نہیں، اسی کیطرف سب کو پلٹنا ہے۔

پھر فرمایا کہ کہاں اللہ کا یہ عظیم کلام اور کہاں مسیلمہ کذاب کا قول۔

"یا ضفدع نقی ما تنقین، لا الشراب تمنعین ولا الماء تکدرین۔"

اے مینڈک! تم جتنا چاہو ٹرٹر کرتے رہو، اپنی ٹرٹر سے نہ تم پینے سے روک سکتے نہ پانی کو گدلا کر سکتے ہو۔"

پھر وہ اپنے قبیلے کے ان لوگوں کو لے کر الگ ہو گئے جو اسلام پر ثابت قدم رہ گئے تھے اور راہ خدا میں جہاد اور اس کے دین کو زمین پر غالب کرنے کے لئے مرتدین کے ساتھ جنگ و قتال میں مشغول ہو گئے

اللہ تعالیٰ حضرت ثمامہ ابن اثال رضی اللہ عنہ کو اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے بہترین جزا دے اور اس جنت سے نوازے جس کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے۔

★

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی ❁ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

انٹرویو

افغان قوم نے گزشتہ ۹ برس میں نفاذِ اسلام کے لئے قربانیاں دی ہیں، بادشاہت کا طوقِ غلامی دوبارہ اپنی گردن میں ڈالنے کے لئے نہیں۔

انجینیر حکمت یار سے رفیق افغان کی بات چیت

ظاہر شاہ کیلئے اب افغانستان میں کوئی جائے پناہ نہیں، انہیں صرف اپنے جرائم کی سزا بھگتنے کیلئے لایا جا سکتا ہے

" اپنے دورہ روسی میں ایک سال ایسا بھی آیا کہ خلق خدا ترا ترا پکار اٹھی۔ جلتا ہوا سورج، جھلستی ہوئی زمین حد درجہ لو اور آگ برس رہی تھی۔ لگتا تھا کہ درے پر اجان کر پسینہ جو چوٹی سے بہتا تو ایڑی تک پہنچتے پہنچتے لال کھلائے جاتے، اور گلاب سے گول مرجھائے جاتے تھے۔ لو کی وہ شدت کہ زمین سے آسمان تک جیسے آگ برس رہی تھی بازار میں اچھا بھلا آدمی چلا جا رہا ہے کہ پیٹ سے گرا اور دیکھتے ہی دیکھتے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ معلوم ہوا لو لگی۔ چڑیا کے بچے کو بھی نہیں بخشا۔ زمین کی تپش کا یہ عالم کہ سرسوں کے دانے پھینکو تو بھن کر چٹخنے لگیں۔ شہر کے آس پاس تمام ندی نالے اور تالاب سوکھ گئے تھے۔"

مرحوم شہید احمد چوہدری کے مذکورہ دونوں بیانات میں سے اگر صرف مقام کا نام تبدیل کر دیا جائے تو جولائی کی تیسری تاریخ کے پشاور میں گرمی کی بعینہٖ یہی کیفیت تھی۔ پنڈی اور اسلام آباد کے آراستہ روئے زمان لاونائیت و دقانیت آلودہ ماحول کے مقابلے میں پشاور کا پہلا تاثر ذہن کے پردے پر ایک کرخت چہرے اور کھردرے ہاتھوں کے مالک دہقان کی شبیہ ابھارتا ہے۔ لیکن ایک ایسا دہقان جو مکمل طور پر کھوٹے مردانگی کا حامل اور سونے کے دل کا مالک ہے۔

حزبِ اسلامی کے سیکرٹری جنرل انجینیر حبیب اللہ کے ساتھ نماز جمعہ کی ادائیگی کے لئے سوئے مسجد روانہ ہوتے تو محسوس ہوا کہ گرمی کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے میں اس سے بڑا فرق پڑ جاتا ہے کہ آپ اسے یخ بستہ کمرے کے بیچ رنگین شیشے کی کھڑکی سے دیکھ رہے یا شدید حدت کے سبب پگھلتے ہوئے تارکول کی سڑک پر برہنہ سفر کرتے ہوئے۔ مسجد پہنچتے پہنچتے قیامت خیز گرمی کا احساس، انجینیر حبیب اللہ کی شستہ گفتگو کے بدولت زائل ہو چکا تھا۔

شام کو انجینیئر حکمت یار سے ملاقات طے تھی۔ نماز ظہر اور عصر کے وقفے کے دوران حزب کے مہمان خانے میں ان دو گھنٹوں میں تفصیلی گفتگو کا موقع ملا۔ ان میں ایک اہم فرد مولوی سرفراز جان بھی تھے۔ گول چہرے پر چوکس آنکھیں، معصومیت بھری اور داڑھی میں کہیں کہیں جھلکتی سفیدی، نفاست کے ذوق پر خود ہونے والی دلنواز مسکراہٹ سے قبل ان کی آنکھوں میں دیے سے جلنے لگتے ہیں۔ نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو، حزب اسلامی کے بانی ارکان میں سے ایک حزب کی سیاسی کمیٹی کے سربراہ حزب کی جانب سے دنیا کی تمام اسلامی تحریکوں اور تنظیموں سے رابطے کے نگران ہیں۔ عربی، اردو، فارسی اور پشتو پر مکمل عبور اور انگریزی سے واجبی شد بد رکھتے ہیں۔ مولوی سرفراز

افغان عوام کو روس دوستی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا گیا ہے

سے ہونے والی دلچسپ گفتگو بھی کسی اور موقع کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ آئیے اب انجینیئر حکمت یار کے پاس چلتے ہیں۔ وہ دیکھیے ساتھ والے کمرے کا پٹ کھلا تو انجینیئر صاحب عرب کے ایک وفد سے گفتگو کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انجینیئر صاحب کے محافظ باہر دروازے کے پاس ہی ایستادہ ہیں۔ مجھے پہچان کر باری باری سلام، معانقے، مصافحے اور پرسش احوال کی تفصیلی رسم ادا کرتے ہیں (جی ہاں! مجاہدین کے ہاں یہی ترتیب ہے)۔ انجینیئر صاحب گفتگو میں مصروف ہیں کہ ایک اگلے کمرے کا در کھلا اور دیکھتے ہی دیکھتے سفید عبا و دستار والا اہلکار ابھر آئے۔ تیز تیز لہجے میں گفتگو کرتے عرب حضرات یکے بعد دیگرے باہر نکلتے ہیں۔ لیجئے اب ہماری باری ہے۔ ہمارے کشادہ کمرے میں داخل ہوتے ہی حکمت یار صاحب میز پر بکھرے کاغذات سمیٹتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ گرم جوش معانقے اور پرجوش مصافحے کے بعد ہم ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرتے ہیں۔ انجینیئر حکمت یار کا شمار دنیا کے ہر فرد سے خواہ وہ نو وارد اجنبی ہو یا مستقل ملاقاتی، مصافحہ کرتے ہوئے چند لمحوں کے لئے مخاطب کا ہاتھ تھام لینا، دلچسپ دل آویز مسکراتی آنکھیں، سر پر جالی دار، دلکش طرز تخاطب کے ساتھ چھوٹے چھوٹے جملوں میں مفصل خیریت دریافت کرنا شستہ افغان روایت کا دل موہ لینے والا اظہار ہے۔ ایسا فرد جسے بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیوں پر ستارے اور رات بھر جاگ کر مکمل تنہائی اور خاموشی سے پہرہ دیتے دیتے روایت سے ہٹ کر آزادی سے سوچنا آگیا ہو اور جس نے فطرت کے تمام تلخ اور دلچسپ اثرات خود اسی کے حوالے سے حاصل کیے ہوں، ایسے فرد کو قدرت نے کسی عظیم المیے کا ہیرو بننے کے لئے پیدا کیا ہوتا ہے۔ بلاشبہ گلبدین حکمت یار کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جو ان سے انٹرویو لینے کے لئے عجلت میں وقت لینے پر اظہار معذرت کرتا ہوں تو مسکرا کر اس انداز میں دیکھتے

ایں گویا گھر رہے ہوں۔ ع ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر

پھر میں ان کا اشارہ پاتے ہی پہلا سوال کرتا ہوں۔

س: مسئلہ افغانستان کے حل کے حوالے سے کسی امید افزا حل کی جانب قدم بہ قدم بڑھنے کا سلسلہ یک لخت ساکت ہو گیا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ جنیوا مذاکرات میں ایک بریک تعطل آ گیا ہے۔ اسکی کیا وجوہات ہیں؟

ج: میرے تجزیے کے مطابق مسئلے سے متاثرہ ملک پاکستان اور براہ راست فریق روس کے درمیان کسی نہ کسی سطح پر مذاکرات کا سلسلہ جاری ہے۔ خود امریکہ بھی اپنے تئیں روس سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے ہے۔ ماسکو اور واشنگٹن کے درمیان خصوصی گفتگو کے جاری سلسلے اور ہر دو ممالک کی جانب سے ظاہر شدہ توقعات وسیع پروپیگنڈہ کی مہم اس بات کی غماز ہے کہ ظاہر شدہ گفتگو کے پس منظر میں جنیوا ایسا نکتہ موجود ہے جو ان کے لئے محض جزوی طور پر قابل قبول ہے۔ چونکہ حتمی طور پر کوئی چیز طے نہیں پائی ہے لہذا جنیوا کی تواریخ کا اعلان مسلسل ملتوی کیا جا رہا ہے۔ جنیوا میں طے کئے گئے فیصلوں کا محض اعلان ہونا ہے، تاحال کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔

س: چند روز قبل شائع شدہ گورباچوف کے ایک بیان کے مطابق انہیں ایک آزاد، غیر جانبدار اور دوست افغانستان کی ضرورت ہے۔ کیا مجاہدین اس ضرورت کو پورا کر سکیں گے؟

ج: افغانستان ایک آزاد اور غیر جانبدار ملک تو اس وقت کہلائے گا جب روسی افواج بلا کسی شرط کے انخلاء پر عمل کر دیں۔ روس کی جانب سے اس نوعیت کا اعلان بڑا عجیب و غریب اور الجھن میں ڈالنے والا ہے۔ ہماری خود مختاری اور غیر جانبداری تو خود روس نے غصب کی ہے۔ گزشتہ ادوار میں ہماری سب سے زیادہ قربت اور دوستی روس ہی سے تھی اور اس دوستی پر روس کے ہماری جانب سے اظہار فخر کیا جاتا رہا لہذا ہم تو روس کی دوستی کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھے ہیں۔ اس اعلان کے ذریعہ اگر گورباچوف یہ خدشہ کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ روسی افواج کی واپسی کے بعد افغانستان مغربی طاقتوں کے لئے لانچنگ پیڈ کا کام دے گا تو میرے خیال میں یہ خدشہ بے بنیاد ہے کیونکہ ہم کھلم کھلا دو ٹوک یہ اعلان کرتے رہے ہیں کہ مستقبل کا افغانستان کسی بیرونی قوت کا اڈہ نہیں ہوگا۔ اگر اس بات کا اظہار مقصود ہے کہ انہیں اپنی جنوبی سرحدوں کو کسی قسم کا خطرہ لاحق ہوتا نظر آتا ہے تو پھر یہ اعلان افغانستان میں روسی تجاوز اور فوجی جارحیت کے وحشیانہ اور غیر قانونی اقدام کو بوسیدہ دلائل کے ذریعے معصومانہ اور قانونی قرار دینے کی لاحاصل بحث کا آغاز اور بہانہ ہے۔

کیا یہ بات عقل میں آتی ہے کہ ایک ضعیف، کمزور، فرسودہ اور محدود وسائل رکھنے والا ملک جو تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک میں بھی سب سے پچھلی صفوں میں کھڑا ہو، مستقبل میں ایک عظیم طاقت کے لئے ایسے خطرے کا باعث بن سکے جس کے سبب اس سپر طاقت کو زندہ حالت میں اپنی فوجیں واپس کھینچنے میں پس و پیش کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

(اسی دوران ایک مچھر پیالہ قہوہ کے گرد منڈلاتا ہے، وہ میز پر لگا کر واپس لوٹ جاتا ہے۔ قہوے کے گرم چسکے حلق کی پرتوں میں ترنگ ڈالتے ہیں۔ چند جرعوں کے بعد اگلا سوال کرتا ہوں)

س: کابل انتظامیہ نے قومی مصالحت کے اعلان اور یک طرفہ جنگ بندی کی مدت میں اضافے کا اعلان کیا ہے، کیا یہ اعلانات مسئلے کے حل کے امکانات میں اضافے کا سبب بنے ہیں؟

ج: (تیزی سے جواب دیتے ہوئے) مصالحت کی بات محض زبانی جمع خرچ ہے۔ اس نوعیت کے پہلے اعلانات کے بعد سے جنگ کی شدت میں ہمیشہ کے مقابلے میں زیادہ اضافہ ہوا ہے اور مزید ہوتا جا رہا ہے۔ دیکھئے جنگ بندی ہمیشہ اسی وقت کارگر اور بہتر نتائج دلوں پر اثر انداز ہوتی ہے جب اسے عملی جامہ پہنانے پر متحارب فریقین تیار ہوں۔ پھر یہ بھی کہ دونوں فریق کسی وقت رضامند ہو سکتے ہیں جب جنگ کے آغاز

کابل انتظامیہ نہیں، روس جنگ کا اصل فریق ہے۔ روسی افواج کی واپسی کے بغیر جنگ بندی موثر نہیں ہو سکتی

کے عوامل میں کوئی بڑی تبدیلی آئے۔ لیکن یہاں صورت حال یہ ہے کہ اولاً تو کابل انتظامیہ اس جنگ میں فریق ہے ہی نہیں، اصل فریق تو روسی افواج ہیں جو مجاہدین سے مستقل جنگ آزما ہیں۔ دوسری طرف جنگ کے آغاز کا سب سے اہم عامل یعنی روسی افواج کی افغانستان میں موجودگی، تمام تر صورت حال کو جوں کا توں رکھنے والا معاملات کو منجمد کر دینے کا سبب بنی ہوئی ہے لہٰذا کسی بھی نوعیت کا لفظی اعلان جنگ بندی شاید ان لوگوں کو تو وقتی طور پر مخمصے میں ڈالنے کا سبب بن جائے جو افغانستان کی موجودہ صورت حال سے پوری طرح واقف نہیں ہیں لیکن عملاً جنگ بندی جیسے پیچیدہ حل کے آغاز کی کوئی مخلص و سنجیدہ کوشش نہیں کہلائی جا سکتی درحقیقت اس قسم کے اعلانات سے بہر صورت روس ہی کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جنگ تو بند نہیں ہوگی لیکن یہ اعلان امکانی طور پر عالمی رائے میں روسی جارحیت کے خلاف بڑھتے ہوئے ردعمل اور تنفر کی شدت کو کم کرنے کے لئے پروپیگنڈہ کے طور پر ضرور کام دے سکتا ہے اور یہی روسیوں کا منشا بھی ہے اور اگر نہیں تو

عجیب سا استفسار کیا جائے کہ پچھلے اعلان جنگ بندی نے جنگ پر کیا اثرات مرتب کئے ہیں؟ کیا اس کے بعد سے جنگ میں کمی واقع ہوئی ہے؟ ایک بات بہر حال طے شدہ ہے اور وہ یہ کہ جنگ کے اختتام کی فقط ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ روسی افواج بلا کسی شرط کے فوری طور پر انخلاء کر جائیں۔ ان کی جسمانی موجودگی (PHYSICAL PRESENCE) میں افغان ملت ہر قسم کا اعلان جنگ بندی رد کر دے گی۔

س: یہ سنا ہے کہ اگر کابل، ماسکو اور واشنگٹن تینوں ظاہر شاہ پر متفق ہیں تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟

ج: یہ ایک عجیب بات ہے کہ پچھلے کئی برسوں سے روسی حکومت اور کابل انتظامیہ کی جانب سے ظاہر شاہ کے دور حکومت پر نکتہ چینی کا سلسلہ جاری تھا۔ اب ایک طویل مدت کے بعد روسیوں کو احساس ہوا کہ انہوں نے ظاہر شاہ کو مطعون کر کے غلطی کی کیونکہ وہ تو ان کے لئے ایک اہم مہرہ ثابت ہو سکتا ہے۔ بنا بریں اس فرد گذاشت پر تلافی کرتے ہوئے انہوں نے ظاہر شاہ کی آمد کو اپنے لئے مفید قرار دیا ہے لیکن ایک بات وہ بھی جانتے ہیں اور وہ یہ کہ ظاہر شاہ کیلئے افغانستان میں کوئی جگہ محفوظ نہیں۔ اس کی جانب سے صادر کئے گئے کسی حکم کی تعمیل کروانا خود اس کے بس میں بھی ممکن نہیں۔ کجا یہ کہ دوسرے لوگ اسے تسلیم کر لیں؟ میرا یقین ہے کہ ملت افغانستان پر اب کوئی اقتدار جبری طور پر خارجی ذرائع سے مسلط نہیں کر سکتا۔ جب روس جیسا ملک مسلسل نو برسوں پر محیط جنگ اور لاکھوں کی تعداد میں افواج کی مدد و معاونت کے باوجود اپنی خواہشات پر قادر نہ ہو سکا تو ظاہر شاہ اس کے مقابلے میں کس حیثیت کا حامل ہے۔ ظاہر شاہ اگر افغانستان آنا چاہتا ہے تو اس کے سامنے فقط دو راہیں کھلی ہیں۔ اولاً وہ افغانستان میں روسی افواج کی موجودگی میں قدم دھرے لیکن خیال ہے کہ پھر روسیوں کی واپسی کے بعد کوئی ایسی قوت نہ ہوگی جو اسے افغان کے قہر و غضب سے بچا سکے کیونکہ اس وقت وہ ببرک اور نجیب سے مختلف نہ ہوگا۔ ثانیاً وہ روسی افواج کے انخلاء کے بعد افغانستان پر اپنے اقتدار کے تسلط کی کوشش کرے۔ ایسی صورت میں افغانستان کی موجودہ سرگرم قوتوں اور عناصر میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو اس کی حمایت اور اس کے ہاتھ کام کے لئے کمربستہ ہو۔

غور طلب بات یہ ہے کہ کابل انتظامیہ اور وہ لوگ جو ظاہر شاہ کے آنے کی حمایت اور اس سے اپنی قربت و محبت کا اظہار کرتے نہیں تھکتے، اس وقت کہاں تھے جب ظاہر شاہ کو اقتدار سے محروم کیا گیا تھا۔ داؤد کے "انقلاب سپید" کا ہوا تو انہوں نے ظاہر شاہ کے حق میں ایک گولی بھی نہیں چلائی یا اس کے بارے میں ایک

کلمۂ حمایت بھی زبان پر نہ لا سکے لیکن، پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ گیا ہے اور نئی حالت میں کہ افغان ملت اپنے تمام مصائب و آلام کا ذمہ دار ظاہر شاہ کو ٹھہراتی ہے، کس طرح اس کی حمایت پر آمادہ ہوگی؟ ظاہر شاہ وہ وقت بھول گیا جب وہ محمد زئیوں کے بغاوتی قول میں شہنشاہ کی طرح بیٹھا اور بیٹھی ہوں

روسیوں نے اپنے خلاف عالمی ردعمل اور نفرت کے جذبات کم کرنے کیلئے کابل انتظامیہ سے یکطرفہ اعلان جنگ بندی کرایا ہے

کے شیر گرم آنسوؤں کے سوا کچھ نہ پیتا تھا۔ گزشتہ ۹ برسوں کے دوران میں نے روسی بربریت کا شکار کسی ایک یتیم افغان بچے کے سر پر دست شفقت رکھا؟ کسی شہید کے لئے دعائے خیر کی؟ ہم تو اب تک اس کے افعال کے زہر آلود پھل اور کانٹے دار تھے زبان کاٹ رہے ہیں لیکن یاد رہے کہ ہم نے اتنی بڑی قربانی دے کر میدان اس لئے صاف نہیں کر رہے کہ بادشاہ موصوف یہاں "قدم رنجہ" فرمائیں اور ایک بار پھر اپنے "طوق غلامی" سے افغان قوم کو "سرفراز" فرمائیں۔ ہم یہ میدان اسلام کے نفاذ کے لئے تیار کر رہے ہیں۔ اس سے کم پر ہم کسی صورت نہ مانیں گے۔ میں یہ بات شد و مد سے کہتا ہوں کہ اگر مغربی قوتوں نے روس سے مل کر ظاہر شاہ کو دوبارہ افغانستان لانے کی سازش کی تو وہ ایک عظیم غلطی کی مرتکب ہوں گی کیونکہ ظاہر شاہ افغان تحریک مزاحمت کو کچل کر روس کے دوبارہ آنے کی راہ ہموار کرے گا۔

ہاں۔ ظاہر شاہ کے آنے کی ایک اور صورت ہے کہ وہ یہ کہ اسے اس کے جرائم کی سزا سنانے اور بھگتنے کے لئے افغانستان لایا جائے۔ ظاہر شاہ کے دور کے دیگر کئی افراد اپنے جرائم کی سزا بھگت چکے ہیں اب وہی باقی رہ گیا ہے جو انشاء اللہ جلد ہی مکافات عمل کے دائرے میں لایا جائے گا۔ مسئلہ افغانستان سے متاثرہ ممالک کے لئے بھی ظاہر شاہ کوئی قابل قبول متبادل نہیں ہو سکتا۔ پاکستانی عوام آمریت کے خلاف اور جمہوری طرز کے حامی ہیں، جو بات وہ اپنے لئے قبول نہیں کرتے وہ یقیناً اپنے افغان بھائیوں کے لئے بھی نہیں چاہیں گے۔ جہاں تک ایران کا تعلق ہے تو فی الحقیقت انھوں نے انقلاب کے بعد قربانیاں دے کر بادشاہت سے چھٹکارا حاصل کیا ہے، وہ اپنے پڑوس میں دوبارہ ظاہر شاہ کی صورت میں بادشاہت کا احیاء کس طرح برداشت کر سکتے ہیں؟

س: افغان مجاہدین تمام مسلمانوں کی یکجہتی اور اتحاد کی علامت بن گئے ہیں کیونکہ وہ اس جنگ کو ساری دنیا کے

مسلمانوں کی جنگ قرار دیتے ہیں۔ اس حوالے سے ہندوستان میں مسلمانوں پر توڑے جانے والے مظالم اور ان کے قتل عام پر آپ کیا کہتے ہیں؟

ج: ہم دنیا کے ہر کونے میں بسنے والے مسلمانوں پر کئے جانے والے مظالم، جبر، تشدد اور انھیں محکومی کی زنجیروں میں اسیر کرنے کے خلاف اعلان جہاد کرتے ہیں۔ بھارت کے مظلوم عوام ہر نوعیت کے تعاون و مدد کے مستحق ہیں۔ بھارت میں ہونے والے مظالم کے خلاف ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ پورا عالم اسلام سراپا احتجاج بن کر ان کے دفاع کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا لیکن عالم اسلام کا یہ سکوت بے اعتنائی اور بے حسی انتہائی شرمناک اور قابل افسوس ہے۔ کاش افغانستان میں ایک اور احمد شاہ ابدالی و سلطان محمود غزنوی ہوتا جو

بھارت کے مظلوم مسلمانوں سے عالم اسلام کی بے اعتنائی نہایت شرمناک اور قابل افسوس ہے

ان مظلوموں کی پکار پر لبیک کہتا۔

راجیو گاندھی کی حکومت کے رویہ کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک طرف وہ اندرون بھارت کے مسلمانوں پر ظلم و تعدی کے پہاڑ توڑ رہے ہیں تو دوسری طرف افغانستان میں روسی تجاوز کی مکمل حمایت کرتے ہوئے اس کے خلاف ایک لفظ بھی بولنے پر آمادہ نہیں۔ کیا غیر جانبدار تحریک کے بانی رکن، تیسری دنیا کے سرکردہ ملک اور شہری آزادیوں کی چیمپئن جمہوریہ کو حقائق کے آئینے میں جھانکنے کی ذرا بھی فرصت نہیں۔ وہ تو بنیادی انسانی حقوق اور اقلیتوں کے تحفظ کے راگ الاپتے نہیں تھکتے، کیا لادینی جمہوری معاشروں اور حکومتوں کے یہی چلن ہوتے ہیں؟ بات صرف اتنی ہے کہ جمہوریت، بنیادی حقوق اور سیکولر ازم کے دلفریب نعرے محض پردہ پوشی کی خاطر بلند کئے جاتے ہیں، ورنہ ان کے مستحق صرف ہندو ہی ٹھہرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کو کوئی حق نہیں کہ وہ برابری کی بنیاد پر اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کریں۔ بھارت کی موجودہ چشم کشا صورت حال پورے عالم اسلام کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔

اس جواب کے ساتھ ہی انھوں نے استفہامیہ انداز میں میری جانب دیکھا اور پھر گھڑی پر نظر دوڑائی۔ میں نے انھیں اطمینان دلایا کہ بس اب آخری سوال ہی رہ گیا ہے، اس کے بعد انھیں اجازت ہوگی۔

س: آخری سوال یہ ہے کہ کیا یہ بہتر ہوگا کہ مجاہدین روسیوں کے واپس جانے کے عمل اور اپنے

بعد کی متوقع صورت حال کے حوالے سے کوئی قابل عمل لائحہ عمل وضع کریں؟

ج: جواب۔ اس ضمن میں ہماری جانب سے جو ہدایت کے جامع اتحاد کی مرکزی شوریٰ کو ایک نئی تجویز دی گئی ہے جو شوریٰ کے اجلاس نے منظور کر لی ہے۔ اس تجویز کے مطابق ہم اعلان کر دیں گے کہ روسی افواج کی واپسی کا "نظام الاوقات" "لاجسٹک" کے مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے طے کیا جائے گویا اس نکتے پر گفتگو کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن یہ عمل اس یقین دہانی کے حصول کے بعد ہی کیا جائے گا کہ روسی واپس جانے میں سنجیدہ ہیں۔ دوسرے مرحلے پر تمام روسی دستے افغانستان کے ایسے مقامات پر جمع کر دیئے جائیں جہاں سے ان کی روانگی با آسانی عمل میں آ سکے۔ یہ اہم نکات شین ڈنڈ ہوائی اڈہ، بگرام ہوائی اڈہ، قندھار، دشت ابدال اور دیہہ دادی ہیں۔ یہاں روسی افواج کے اجتماع سے ہمیں اطمینان ہو جائے گا کہ روسی دستے واپس جانا چاہتے ہیں۔ تیسرے مرحلے پر افغانستان میں بکھری ہوئی مخصوص فوجی چوکیوں سے تمام مقامی سپاہی یا ملیشیا اپنی چھاؤنیوں اور بیرکوں کو واپس لوٹ جائیں اور پوسٹیں خالی کر دی جائیں۔ اس طریقے سے دوبارہ جنگ چھڑنے کے امکانات بڑی حد تک معدوم ہو جائیں گے۔ مزید اگلے مرحلے میں موجودہ کابل انتظامیہ کے بجائے ایسے افراد کو حکومتی ذمہ داریاں سونپی جائیں جو مجاہدین کے لئے قابل قبول ہو سکتے ہوں۔ اس حکومت کا کام صرف روسی افواج کی واپسی کے عمل کی نگرانی ہوگا۔ دوسری طرف افغانستان کی افواج کے تمام کور، ڈویژن اور بریگیڈ کمانڈ کی حیثیت سے ایسے افراد کو تعینات کیا جائے جو مجاہدین کے لئے بھی باعث اطمینان ہوں۔ مزید یہ کہ ایسے تمام سابق افسران جو افغان فوج چھوڑ کر مجاہدین سے آن ملے تھے دوبارہ پرچمی یا خلقیوں میں "انقلاب ثور" سے پہلے کی حیثیتوں میں متعین کر دیئے جائیں۔ ان تمام اقدامات اور مجوزہ تبدیلیوں کی وجہ سے کہ ان پر عمل درآمد ہونے کی صورت میں اولاً مجاہدین اور روسیوں کے درمیان عدم اعتماد کی فضا ختم ہو جائے گی، ثانیاً یہ افواج روسیوں کی واپسی کے بعد امن عامہ کی بحالی کا کام بحسن و خوبی انجام دے سکیں گی۔ ثالثاً روسیوں کی جانب سے کسی بھی امکانی دھوکہ یا واپسی کے عمل کے دوران اچانک پلٹنے کی روک تھام ہو سکے گی۔ رابعاً یہ احتیاط روسیوں کی واپسی کے بعد عارضی حکومت کے عزائم اور نیت میں تبدیلی کے خدشے کے پیش نظر سود مند ثابت ہوگی۔ ●●

پاکستانی شاعر عبید اللہ علیم کا دیوان

"ویرانی سرائے کا دیا"[1]

ابو سفیان اصلاحی

"ویرانی سرائے کا دیا" سے متعلق کچھ کہنے سے قبل مناسب ہے کہ صاحب دیوان سے متعلق کچھ بتایا جائے۔ عبید اللہ علیم جدید شعراء میں ایک نمایاں شخصیت کے حامل ہیں۔ نظم اور غزل دونوں ہی کے شاعر ہیں۔ بنیادی طور پر وہ غزل گو شاعر ہیں۔ غزل کے رنج و غم اور اس کی نزاکت سے خوب واقف ہیں۔ عصری آشوبوں اور نت نئے مسائل سے آنکھیں ملا کر چلتے ہیں۔ ذاتی کرب و درد کے ساتھ ساتھ معاشرہ پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ قوت شاہدہ انھیں گہرائیوں میں اتار دیتی ہے۔ وہ وقت کی آواز اور سماج کے ترجمان ہیں۔ ان کے یہاں جدید شعراء کی سی بغاوت اور ترقی پسندوں کی سی انتہا پسندی نہیں ملے گی کیونکہ جدید شاعری زیادہ تر الفاظ کی ہیرا پھیری اور ترقی پسند شاعری لے دے کر مارکسزم ہے۔ وہ اپنی شاعری کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"میں نفس گر مغموم آدم کے لشکر کا ہراول سپاہی ہوں۔ میں ابلیس خودی، وہ انا کے مقابلے پر آدم کا یقین، بیچارگی اور دعا کا زاد سفر لے کر نکلا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ رحمت کے بادل اس ابلیسی آگ کو پھر ٹھنڈا کرنے کے لئے گھر رہے ہیں۔ میرا چاند چہرہ اب دعا دعا چہرہ ہو گیا ہے، میری ستارہ آنکھیں اب حیا حیا آنکھیں ہو گئی ہیں۔ میں کسی نظریے یا خیال کے رد عمل و ترکی عمل کا شاعر نہیں، میں اپنے مسلسل ظہور اور اپنی متواتر یقینی پیدائش کا شاعر ہوں۔ میں زمینی اور آسمانی رشتوں، محبتوں اور صداقتوں کا شاعر ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ایسے ہی لوگوں پر فنا کا قانون منسوخ ہو جاتا ہے۔"[2]

---

[1] اس مجموعے سے قبل علیم کا ایک مجموعہ "چاند چہرہ ستارہ آنکھیں" چھپ چکا ہے جس پر یونیورسٹی کی "محسن" میگزین میں شائع ہو چکا ہے۔

[2] یہ اقتباس "ویرانی سرائے کا دیا" سے ماخوذ ہے۔

"دیا نئی سرائے کا دیا" کی طباعت و کتابت دونوں ہی قابلِ تعریف ہیں۔ ٹائٹل نہایت ہی حسین و دیدہ زیب، ۱۵۵ صفحات پر، ۷۴ غزلیات، ۲۰ نظمیں اور چار گیت پر پھیلے ہوئے ہیں۔ سرورق میر کا یہ شعر :

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

علیم کو میر تقی میر سے بڑی عقیدت ہے۔ میریت ان کے انگ انگ میں سرایت کر گئی ہے۔ آخر وہ کے دوران بتایا گیا کہ میر میرا محبوب شاعر ہے۔ وہ فراق گورکھپوری کا یہ قول حق بجانب ہے کہ "ہر چیز کا ایک خدا ہے، اردو شاعری بھی اپنا خدا رکھتی ہے اور وہ میر کے نام سے جانا جاتا ہے"۔ علیم اپنے اشعار میں جا بجا میر کا ذکر کرتے ہیں ؎

ملتا جلتا تھا حال میر کے ساتھ
میں بھی زندہ رہا ضمیر کے ساتھ

غزل کسی زمانے میں گل و بلبل اور حسن و عشق کی داستان سرائی کا نام تھا لیکن آج کی غزل حالات کی پشت پر پا بہ رکاب ہے۔ عصری مسائل سے گراں بار ہے، غمِ جاناں سے زیادہ غمِ دوراں کی ترجمان ہے وہ بیک وقت مختلف النوع مضامین کو سمیٹے ہوئے ہے۔ علیم بڑا ہی لطیف اور حساس شاعر ہے۔ وہ تاریکیوں میں چلنا اور حالات سے نبرد آزما ہونا خوب جانتا ہے ؎

رکھو سجدے میں سر اور بھول جاؤ
کہ وقتِ عصر ہے اور کربلا ہے

کون سی کشتی میں بیٹھیں تیرے بندے مولا
اب جو دنیا کوئی سیلاب اٹھا کر لائے

بچھڑ کے اپنے دوستوں سے
وہ پھول پڑے کہ خشک تھا میں

علیم نے جہاں مایوسیوں، اداسیوں اور محرومیوں کا تجزیہ بہت قریب سے کیا ہے وہیں اس نے اپنے محبوب کو بھی ایک نئے لباس، نئے انداز و آہنگ اور جدید سر میں پیش کیا ہے۔ اس نے ان رسموں اور روایتوں سے انحراف کیا جو صدیوں سے صنفِ شاعری، بالخصوص غزل کی زینت بنے ہوئے تھے۔ آج کا شاعر محبوب کو دوسرے انداز سے دیکھتا ہے کیونکہ "اور بھی کام ہیں دنیا میں محبت کے سوا" یہ دراصل عصری حیات کی دین ہے۔ لیجئے علیم کو سنئے ؎

کوچۂ عشق سے کچھ خواب اٹھا کر لے آئے
تھے گدا تحفۂ نایاب اٹھا کر لے آئے

تمھارے بعد بھی کچھ دن بہت سہانے لگے
پھر اس کے بعد اندھیرے دیئے جلانے لگے

چمک رہا تھا وہ چاند اور اس کی محفل میں
سب آنکھیں آئینے جیسے شراب خانے لگے

وہ روشنی کہ آنکھ اٹھائی نہیں گئی
کل مجھ سے میرا چاند بہت ہی قریب تھا

اپنا احوال سنا کر لے جائے
جب مجھے چاہے منا کر لے جائے

ہوں خفا اس سے مگر اتنا نہیں
خود نہ جاؤں گا بلا کر لے جائے

سیاہ رات کی حد میں اگر نکل آئے
دیئے کے سامنے خورشید جھلملانے لگے

میرے لہو میں جس کا کوئی ذائقہ نہیں
دیکھوں وہی میں خواب سہانے کہاں تلک

آج کی شاعری میں علامتوں کا استعمال کثرت سے ہونے لگا ہے۔ علامتوں کا استعمال تو آغازِ شاعری سے ہی پایا جاتا ہے مگر موجودہ شعراء کے یہاں اس کا جنون سا پایا جاتا ہے۔ علامتوں کے نام پر نہ جانے کیا کیا کہتے رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کی شاعری علامتوں کی بہتات کے سبب CONFUSION کا شکار ہو کر رہ گئی ہے جب کہ عظیم ناقد شمس الرحمان فاروقی نے اسے خوب HIGHLIGHT کیا ہے۔ لیکن علیم کے یہاں وہ علامتیں ملتی ہیں جو قارئین کے فہم سے بالاتر نہیں ہیں ؎

گزری ہوئی رات کی کہانی
وہ شمع تھی وہ پتنگ تھا میں

خالی ہاتھوں کو ملے گی خوشبو
جب ہوا چاہے چرا کر لے جائے

جو پیڑ ہو تو زمیں سے ہی کھینچ پانی
کہ ابر آئے گا کوئی، یہ آس مت کرنا

آہستہ پگھل کر بجھ رہا ہے
آؤ پتھر سے توڑ جاؤ

اندھیرے میں عجب اک روشنی ہے
کوئی خیمہ دیا سا جل رہا ہے

علیم نے اس مجموعہ میں کچھ غزل نعت بھی شامل کیا ہے۔ اس میں اس نے اپنا منفرد لہجہ برقرار رکھا ہے ماضی کی روایتی انداز سے ہوتے ہوئے گزر گیا ہے ؎

درود پڑھتے ہوئے اس کی دید کو نکلیں
تو صبح پھول بچھائے صبا ہمارے لئے

عجب کیفیت جذب و حال رکھتی ہے
تمہارے شہر کی آب و ہوا ہمارے لئے

دیئے جلائے ہوئے ساتھ ساتھ رہتی ہے
تمہاری یاد، تمہاری دعا، ہمارے لئے

بنانے والے نے اس شان سے بنایا اسے
جہاں سے دیکھو نظر آئے جو منابِ ذات

ادارہ

جامعہ کے لیل و نہار

عید الضحیٰ کی تعطیل گزار کر طلبہ اپنے گھروں سے مدرسہ آگئے ہیں اور تعلیم میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اساتذہ کرام بھی انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ ششماہی امتحان تک نصف کورس پورا ہو جائے۔ ششماہی امتحان اب چند ہی ماہ رہ گئے ہیں اس طرح پڑھنے لکھنے کا ایک مثالی ماحول بنتا جا رہا ہے۔

تعلیمی کمیٹی کا اجلاس

۱۰ر اگست ۱۹۸۸ء کو مدرسہ کی تعلیمی کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ جناب افضل حسین صاحب ایم اے ایل ٹی قیم جماعت اسلامی ہند اور دیگر ممبران کمیٹی تشریف لائے اور جامعہ کے نصاب تعلیم پر غور و خوض اور فیصلے کئے۔ کمیٹی نے باتفاق یہ طے کیا کہ آئندہ سال سے حسب معمول سابقہ نصاب ہی پڑھایا جائے گا۔ N.C.E.R.T کی کتابیں نہیں پڑھائی جائیں گی۔ درجہ اطفال سے درجہ ششم ثانوی تک جماعت اسلامی کا تیار کردہ نصاب ہی پڑھایا جائے گا اور درجہ ہفتم و درجہ ہشتم میں سائنس، جغرافیہ اور ریاضی کی کتابیں یوپی بورڈ یا مہاراشٹر گورنمنٹ کی تیار کردہ کتابیں اس وقت تک پڑھائی جائیں گی جب تک جماعت اپنا نصاب نہ تیار کر لے۔

انتظامیہ کا اجلاس

۱۰ر اگست ۱۹۸۸ء کو مدرسہ کی انتظامیہ کا اجلاس بعد نماز مغرب مدرسہ کی لائبریری میں منعقد ہوا۔ مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی ہند اور دوسرے ممبران شریک اجلاس رہے۔ مدرسہ کے مختلف مسائل پر غور و فیصلے ہوئے۔ مشہور عالم دین اور جامعۃ الفلاح کے ناظم مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب کی درخواست پر غور کیا گیا جنہیں موصوف نے اپنی علالت کی بنا پر جامعہ کی نظامت سے علیحدگی کی خواہش ظاہر کی تھی۔ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ مولانا ایک قیمتی اثاثہ ہیں ان سے استفادہ کی شکلیں جاری رہنی چاہئے اور نظامت بھی استفادہ کی ایک شکل ہے۔

بڑھتی ہوئی گرانی کے پیش نظر اساتذہ کے گرانی الاؤنس میں اضافہ کیا گیا۔

انجمن طلبہ قدیم کی مقامی شوریٰ کا اجلاس

۲۰ر اگست ۸۸ء صبح ۷ بجے انجمن کی مقامی شوریٰ کی ایک میٹنگ دفتر انجمن میں بلائی گئی۔ نسیم احمد غازی صدر انجمن، جاوید اشرف قاسمی سکریٹری، انصار احمد صاحب خزانچی، [illegible] صاحب، [illegible] اللہ صاحب، محمد عمران صاحب اور طارق فلاحی شریک اجلاس رہے۔ طے کیا گیا کہ انجمن کی مکمل شوریٰ کا اجلاس ۲۹، ۳۰ر اکتوبر ۱۹۸۸ء بروز جمعرات، جمعہ منعقد ہوگا۔ پروگرام بنانے والی کمیٹی کے لئے کچھ سفارشات بھی طے کی گئیں۔

قیم جماعت جناب افضل حسین صاحب کی طلبہ و اساتذہ سے گفتگو

افضل حسین صاحب کی ذات علم و عمل، حکمت و دانائی کے ایسے بیش بہا خزانے اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ افضل حسین صاحب کی آمد جامعہ کے لئے پیغام مسرت و شادمانی کا باعث ہوئی۔ ہر طالب علم اور استاد نے ان سے استفادہ کے راستے تلاش کئے۔ طلبہ نے انفرادی ملاقاتوں اور بات چیت کے علاوہ اجتماعی پروگرام بھی منعقد کئے۔ سکریٹری کے آغاز کلام کے بعد بڑے طلبہ نے جامعہ کا ترانہ اور چھوٹے بچوں نے ترانۂ مسلم پیش کیا۔ مولانا عبدالحسیب صاحب صدر جامعہ نے موصوف کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اپنے افتتاحی کلمات میں فرمایا "آپ بچوں کے محسن اعظم ہیں۔ آپ نے منفرد خصوصیات کی حامل دینیات کا کام کیا۔ آپ نے ان دینیات کے ذریعے بچوں کو ایک سیدھی سچی اور پاکیزہ راہ کی طرف رہنمائی کی ہے"

جناب افضل حسین صاحب نے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ جامعہ سے میرا تعلق بہت پرانا ہے ۱۹۶۲ء میں جب جامعہ کا کل خاکہ بنایا گیا تو اس وقت میں بھی موجود تھا۔ آپ بچوں سے کہا کہ آپ کی زندگی کے لمحات بہرحال بڑے ہی قیمتی ہیں آپ اس وقت جو کچھ کمائیں گے اس کا ثمرہ زندگی بھر ملے گا۔ آپ خوب محنت سے تیاری کریں۔ آپ کو زندگی کے میدان میں ایک بہت بڑی ذمہ داری ادا کرنی ہے۔ آپ کو اپنے اسلاف کا سرمایہ دوسروں تک منتقل کرنا ہے۔ اگر جنریشن گیپ پیدا ہو، اساتذہ سے پورا پورا فائدہ اٹھایئے۔ والدین کا احترام کیجئے۔ نماز کا اہتمام کیجئے۔

برائیوں سے دور رہیں گے، گناہ اور حافظہ میں گہرا تعلق ہے گناہ سے دور رہئے حافظہ قوی ہوگا دوسروں کے عیوب پر نظر رکھنے کے بجائے اپنے اندر جھانکنے کی کوشش کیجئے، اس سے آپ کی اصلاح ہوگی۔

ہال میں آپ کے اعزاز میں ایک پارٹی دی گئی جس میں تمام اساتذہ اور کارکنان جامعہ شریک تھے، چائے کے بعد موصوف نے اساتذہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا میں بھی آپ کا ہم پیشہ رہا ہوں میں نے طلبہ سے پوچھا استاد کیسا ہونا چاہئے اور ۸، ۱۰ برس کے طلبہ نے جو کچھ بتایا اس کو میں نے جمع کر دیا وہ ایک آئیڈیل استاد کا خاکہ ہو گیا۔

آپ نے فرمایا ایک چھوٹا بچہ بھی محسوس کرتا ہے کہ کون اس سے محبت کرتا ہے اور کون اس سے نفرت کرتا ہے۔ آپ بچوں سے محبت اور ربط تعلق پیدا کیجئے اس سے آپ ان کو اچھی طرح فیض پہنچا سکتے ہیں۔ اگر بچہ سے نفرت کریں گے تو وہ بھی آپ سے نفرت کرے گا اور دور بھاگے گا پھر اس کو ادارہ سے نفرت ہو جائے گی۔ بچہ اگر اچھا کام کرے تو اس کو شاباشی دیجئے، اس کو انعام و تحسین سے نوازیئے، اس سے اس کی ہمت بڑھے گی اور اس کی صلاحیتوں کو جلا ملے گی۔ (یہ پروگرام ۲۰ اگست کو ساڑھے دس بجے شروع ہوا اور ۱۲ بجے اختتام پذیر ہوا)

اسلامی اکیڈمی

یہ اطلاع آپ کے لئے باعث مسرت ہوگی کہ بلریا گنج میں ایک اشاعتی ادارہ "اسلامی اکیڈمی" قائم ہوا ہے جس کا مقصد تحریکی اور دینی کتابوں کی اشاعت ہے اسی ادارے کے زیر اہتمام ایک بک ڈپو "مکتبہ اسلامی" بھی قائم ہوا ہے، جہاں سے فی الحال مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، مکتبہ ذکری رامپور، مکتبہ الحسنات رامپور، ہندوستان پبلیکیشنز اور کریسنٹ دہلی کی کتابیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

پتہ:

ISLAMIC-ACADEMY (MAKTABA ISLAMI)

Jamia Nagar. Bilariaganj (276121) Azamgarh (U.P.)

انشاء اللہ

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا چوتھا

دو سالہ اجلاس

۱۲، ۱۳، ۱۴ فروری ۱۹۸۹ء کو

مادر علمی جامعۃ الفلاح میں منعقد ہو رہا ہے

مکتبہ اسلامیہ

یہ اطلاع دیتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے کہ بلریا گنج میں مکتبہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آچکا ہے انشاء اللہ جلد ہی وہ اپنے اشاعتی پروگرام کے مطابق دینی، علمی، دعوتی، تربیتی نیز معلوماتی کتابوں کی اشاعت شروع کر دیگا۔ فی الحال مولانا محمد ایوب اصلاحی صاحب کی کتاب "عورت تہذیب کے دوراہے پر" زیر طبع ہے جو جلد ہی دوبارہ منظر عام پر آجائے گی۔

ضرورت مند حضرات بکسیلر نیز تاجرانہ نرخ پر ہمارے یہاں سے مرکزی مکتبہ اسلامی، مکتبہ الحسنات، ذکری و حجاب کی کتابیں بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

ابو احمد، مکتبہ اسلامیہ بلریا گنج اعظم گڑھ